قرآن اور سائنس



ڈاکٹر ذاکر نائیک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

www.KitaboSunnat.com

قرآن اور سائنس

ڈاکٹر ذاکر نائیک کی دیگر کتب

- مذاہب عالم میں تصورِ خدا اور اسلام کے بارے میں غیر مسلموں کے ۲۰ سوال
- اسلام میں خواتین کے حقوق
- اسلام دہشت گردی یا عالمی بھائی چارہ
- گوشت خوری جائز یا ناجائز؟
- بائبل اور قرآن ...... جدید سائنس کی روشنی میں
- کیا قرآن کلام خداوندی ہے؟
- اسلام اور ہندومت

قرآن اور سائنس

ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم

علیم احمد

ایڈیٹر ماہنامہ گلوبل سائنس، کراچی

دار النوادر

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

۲۰۰۶ء

کتاب: قرآن اور سائنس

مصنف: ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم: علیم احمد

اہتمام: دار النوادر، لاہور

مطبع: ... پریس، لاہور

قیمت: ۲۰۰ روپے

ڈسٹری بیوٹرز

فضلی بک سپر مارکیٹ
اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور فون: 7320318 فیکس: 7239884
ای میل: hikmat100@hotmail.com

ترتیب

عرضِ مترجم

(چند توجہ طلب باتیں)

اپنے موضوع کے اعتبار سے زیر نظر کتاب بہت اہم ہے، کیونکہ اس میں قرآن پاک اور جدید سائنس کے باہم مطابقت پذیر یا عدم مطابقت پذیر ہونے پر بحث کی گئی ہے۔ تاہم یہ موضوع نہایت حساس بھی ہے، کیونکہ قرآن اور سائنس کے باہمی تعلق پر بات کرتے ہوئے مصنف کی ذرا سی غلطی، قاری کے ذہن سے شبہات واشکالات ختم کرنے کی بجائے نئے شکوک کو جنم دے سکتی ہے۔ زیر نظر کتاب کے سائنسی مباحث کا تنقیدی جائزہ لینا ہمارے لیے ممکن نہیں، لیکن سائنس کے ایک ادنیٰ طالب علم اور ایک گناہ گار و بے عمل مسلمان کی حیثیت سے محترم ذاکر نائیک کی جو باتیں ہمیں تسلیم شدہ سائنسی و تاریخی حقائق سے متصادم محسوس ہوئیں، ان کا تذکرہ کیے بغیر ہمیں ترجمے کا یہ کام نہایت ادھورا لگ رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دیانت داری کا تقاضا پورا کرتے ہوئے ذیل میں ہم کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ کر رہے ہیں جو نفسِ مضمون سے فاضل مصنف کی عدم واقفیت کا نتیجہ ہیں۔

ہم یہ عرض کرنا بھی اشد ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنے تبصرے کو صرف فلکیات، کونیات اور علوم طبیعی تک محدود رکھا ہے کیونکہ انہی شعبہ ہائے علوم سے ہماری واقفیت قدرے زیادہ ہے۔ قارئین اور فاضل مصنف سے درخواست ہے کہ وہ ہماری درج ذیل گزارشات کو محض نکتہ چینی یا تنقیص خیال نہ فرمائیں بلکہ انہیں مثبت تنقید کے طور پر دیکھیں، تاکہ اس کتاب کی آئندہ اشاعتوں میں ان اغلاط کو دور کر کے تبلیغ دین کا یہ علمی کام مزید مؤثر بنایا جا سکے۔

ابتدائے کائنات اور بگ بینگ

محترم مصنف نے ابتدائے کائنات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابتدا میں ساری

کائنات ایک بڑی کمیت (پرائمری نیبولا) کی شکل میں تھی۔ پھر ایک عظیم دھماکہ یعنی بگ بینگ (Secondary Separation) ہوا جس کا نتیجہ کہکشاؤں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ پھر یہ کہکشائیں تقسیم ہو کر ستاروں، سیاروں، سورج اور چاند وغیرہ کی صورت میں آئیں۔

مذکورہ سطور میں محترم مصنف بھی اسی غلط فہمی کا شکار نظر آتے ہیں جو ابتدائے کائنات کے حوالے سے عام لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ سائنسی حقائق اس کے برعکس ہیں۔

درحقیقت ابتدائے کائنات کا لمحہ سائنس دانوں کے لیے آج بھی اتنا ہی پریشان کن ہے جتنا آج سے ۸۰ برس پہلے تھا کہ جب بگ بینگ کا تصور نیا نیا متعارف ہوا تھا۔ ماہرین کونیات (Cosmologists) کا کہنا ہے کہ ابتدا میں کائنات کا سارا مادہ، ساری توانائی اور سارے کا سارا خلا ایک ریاضیاتی نقطے (Mathematical Point) پر مرکوز تھا۔ ریاضیاتی نقطے سے مراد کوئی ایسی شے ہوتی ہے جس کا حجم "صفر" (Zero) ہو، یعنی اس کا کوئی حجم نہ ہو۔ بالفاظِ دیگر ریاضیاتی نقطہ "نہ ہونے" یا "عدم" (Nothingness) کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ کائنات "عدم" سے "وجود" میں آئی ہے۔ سائنس داں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ابتدائے کائنات کے ریاضیاتی نقطے کی کثافت لامتناہی (Infinite) یا لامحدود تھی۔ یعنی ساری کی ساری کائنات ایک ایسے وجود میں سمائی ہوئی تھی جو ایک جانب "عدم" کا ترجمان تھا تو دوسری طرف اس کی کثافت بھی لامحدود تھی۔ ابتدائے کائنات کا یہی لمحہ کہ جب کثیر مادہ اور زمان و مکان یک بہ یک "عدم" سے وجود میں آئے "بگ بینگ" کہلاتا ہے۔

توجہ طلب بات یہ ہے کہ ٹھیک بگ بینگ والے لمحے پر، جسے "صفر وقت" (T=O) بھی کہا جاتا ہے، سارے کے سارے قوانین فطرت (جن سے ہم واقف ہیں) ہمارا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور ان کی بنیاد پر ہم کچھ بھی کہنے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ ایسا کوئی بھی موقع جب قوانین فطرت (اور انہیں عددی شکل میں بیان کرنے والی ریاضیاتی مساواتیں) اپنے بارے میں پیش گوئی کیے جانے کی خاصیت (Predictibility) سے محروم ہو جائیں "وحدانیت"

(Singularity) کہلاتا ہے۔ اور اس وقت سائنس کی سب سے بڑی وحدانیت ''بگ بینگ'' ہے۔

ماہرین کونیات کے نزدیک بالعموم اور الحاد و مادہ پرستی کے علم بردار سائنس دانوں کے لیے بالخصوص، بگ بینگ وحدانیت (Big Bang Singularity) شدید ناپسندیدہ ہے۔ ان کی بے چینی کی وجہ یہ ہے کہ وہ بگ بینگ کے 10^{-43} سیکنڈ (یعنی ایک سیکنڈ کے ایک ارب ارب ارب اربوں حصے کے بھی دس لاکھویں حصے) بعد تک کی سائنسی وضاحت کر سکتے ہیں لیکن ٹھیک صفر سیکنڈ (یعنی T=O) کی سائنسی وضاحت ابھی تک ممکن نہیں۔ اس ضمن میں تقریباً درجن بھر متبادل نظریات موجود ہیں مگر ان میں سے کسی ایک کو بھی اب تک قبولیت عام یا ماہرین کونیات کا عمومی اتفاق رائے حاصل نہیں ہو سکا۔

زیر بحث موضوع میں محترم ذاکر نائیک سے قدرے کم سنجیدگی کی حامل ایک اور غلطی یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے بگ بینگ کے بعد کہکشائیں بننے کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ پھر

''کہکشائیں تقسیم ہو کر ستاروں، سیاروں، سورج اور چاند وغیرہ کی صورت میں آ گئیں۔''

فلکیات و کونیات کی کوئی سی بھی معیاری کتاب اُٹھا کر دیکھ لیجیے، اس میں لفظ ''کہکشاں'' (Galaxy) کی وضاحت میں یہی لکھا ہو گا کہ اربوں کھربوں ستاروں کا مجموعہ کہکشاں کہلاتا ہے۔ ہمارا سورج جس کہکشاں کا ستارہ ہے، اسے ہم دودھیا کہکشاں (ملکی وے) کہتے ہیں، کیونکہ تاریک رات کے آسمان پر یہ دودھ کی نہر کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ بعض تہذیبوں میں اسے ''رات کی ریڑھ کی ہڈی'' (Backbone of Night) بھی کہا جاتا تھا۔ بگ بینگ کے بعد کائنات بڑی تیزی سے پھیلی اور اسی دوران مادے کے بنیادی ذرات (یعنی الیکٹران، پروٹون اور نیوٹرون وغیرہ) بھی وجود میں آئے۔ تاہم یہ سب آزاد حالت میں تھے۔ مزید پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ جب کائنات مزید ٹھنڈی ہوئی تو ایک وقت وہ آیا جب پروٹون اور الیکٹران یکجا ہو کر اوّلین ہائیڈروجن ایٹموں کی شکل میں آئے۔

اگلے مراحل مختصراً یوں ہیں کہ ایٹموں نے یکجا ہو کر اوّلین ستاروں کی شکل اختیار کی اور

کروڑوں اربوں ستارے باہمی کشش ثقل کی وجہ سے جھرمٹوں کی صورت میں آ گئے۔ یہ تھیں اوّلین کہکشائیں جن میں ستاروں کے علاوہ گرم پلازما والے وسیع و عریض گیسی بادل بھی تھے جنہیں سحابیہ (Nebula) کہا جاتا ہے۔ آج بھی کہکشاؤں میں ستاروں کے ساتھ ساتھ یہ گیسی بادل یا سحابیے بھی کثیر مقدار میں موجود ہیں۔ نئے ستارے انہی سحابیوں سے ''پیدا'' ہوتے ہیں۔

زمین کی گولا نما ساخت

زمین کی گولا نما (کروی) ساخت پر بحث کرتے ہوئے محترم مصنف نے یہ لکھا ہے کہ ابتدائی زمانے کے لوگ یہ یقین رکھتے تھے کہ زمین چپٹی ہے، اور یہ کہ سر فرانسس ڈریک وہ پہلا آدمی تھا جس نے ۱۵۹۷ء میں زمین کے گرد (سمندر کے راستے) چکر لگا کر یہ ثابت کیا کہ زمین گول (کروی) ہے۔

سائنس کے مسلمہ تاریخی حقائق کچھ اور بتاتے ہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں زمین کو چپٹا تصور کیا جاتا تھا، کیونکہ کم از کم ۳۴۰ قبل مسیح سے اس بات کے عقلی دلائل موجود تھے کہ زمین گول ہے۔

اُس زمانے میں یونان کے مشہور فلسفی ارسطو نے اپنی ایک تصنیف ''کتاب افلاک'' میں یہ بتایا کہ زمین کسی گول پلیٹ کی طرح چپٹی نہیں بلکہ کسی گیند کی مانند گول ہے۔ مذکورہ تصنیف میں ارسطو نے اس حوالے سے دو اہم دلائل پیش کیے ہیں:

اوّل:...... اس نے محسوس کیا تھا کہ چاند گرہن اسی وقت ہوتا ہے جب سورج اور چاند کے درمیان زمین آ جاتی ہے۔ یعنی چاند گرہن کی وجہ زمین کا سورج اور چاند کے درمیان آ جانا ہے۔ اس دوران زمین کا جو سایہ چاند پر بنتا ہے، وہ ہمیشہ گول ہوتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک یہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا جب زمین کی ساخت کروی (گولے جیسی) ہو۔ اگر ایسا نہیں، اور زمین کو چپٹی پلیٹ ماننے ہی پر اصرار کیا جائے تو مختلف اوقات میں ہونے والے چاند

گرہنوں کے دوران چاند پر بننے والا، زمین کا سایہ بھی لمبوترا اور بیضوی ہونا چاہیے تھا۔ تب یہ بھی ماننا پڑتا کہ جب بھی چاند گرہن ہوتا ہے تو سورج، زمینی پلیٹ کے مرکز کی بالکل سیدھ میں ہوتا ہے، کیونکہ چاند پر زمین کا سایہ ہمیشہ گول ہی دکھائی دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عقل اسے تسلیم نہیں کرتی، لہٰذا زمین کسی گول گیند جیسی ہی ہوسکتی ہے، پلیٹ جیسی نہیں۔

دوم:...... ارسطو کی دوسری دلیل کا تعلق یونانی جہاز رانوں کے اُن مشاہدات سے تھا جو انہیں سفر کے دوران ہوتے تھے۔ یونانی جہاز راں اپنے برسوں پر محیط تجربات کی روشنی میں یہ جانتے تھے کہ جب بھی وہ جنوب کی سمت، کسی دور دراز کے علاقے کا سفر کیا کرتے تھے تو وہاں قطب ستارہ انہیں شمالی علاقوں کے مقابلے میں اُفق سے قریب (نیچا) دکھائی دیتا تھا۔ ارسطو نے اپنی دوسری دلیل میں قطب ستارے کی بلندی میں آنے والے مشاہداتی فرق کو بنیاد بنایا اور کہا کہ اگر زمین کسی پلیٹ کی طرح چپٹی ہوتی، تو شمال سے جنوب (یا جنوب سے شمال) کی طرف جاتے ہوئے قطب ستارے کی اُفق سے بلندی بھی ایک جیسی ہی رہنی چاہیے تھی مگر چونکہ ایسا نہیں ہوتا، لہٰذا زمین بھی کسی گیند جیسی گول ہی ہوسکتی ہے، پلیٹ جیسی نہیں۔

اپنی اسی دوسری دلیل کو بنیاد بناتے ہوئے ارسطو نے مصر اور یونان میں قطب ستارے کی اُفق سے ظاہری بلندی کا فرق معلوم کیا اور حساب لگایا کہ زمین کے گرد ایک مکمل چکر لگانے کے لیے ہمیں چار لاکھ اسٹیڈیا کا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ یاد رہے کہ ''اسٹیڈیم'' (Stadium) کی جمع ''اسٹیڈیا'' (Stadia) ہے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ ایک اسٹیڈیم کی ٹھیک ٹھیک لمبائی کتنی تھی لیکن اندازہ ہے کہ ارسطو کا استعمال کردہ ایک اسٹیڈیم، آج کے تقریباً ۲۰۰ گز کے برابر رہا ہو گا۔ اسی طرح ارسطو کا لگایا ہوا تخمینہ، زمینی محیط کی حالیہ پیمائشوں کے مقابلے میں تقریباً دو گنا معلوم ہوگا۔

ارسطو کے علاوہ قدیم یونان کے دیگر باشندوں، خصوصاً جہاز رانوں کے پاس بھی زمین گول ہونے کی ایک اور دلیل تھی۔ یہ تیسری دلیل کچھ یوں تھی کہ اگر کوئی بحری جہاز دور سے قریب آرہا ہو تو سب سے پہلے اس کے بادبان دکھائی دیتے ہیں (جن کی بلندی سب سے

زیادہ ہوتی ہے) جہاز جیسے جیسے قریب آتا ہے، ویسے ویسے اس کے نچلے حصے بھی دکھائی دینا شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر زمین چپٹی ہوتی تو دُور سے قریب آنے والا بحری جہاز (اوپر سے لے کر نیچے تک) ایک ساتھ دکھائی دینا شروع کرتا۔ زمین کو گیند کی مانند گول ثابت کرنا، قدیم یونان میں عقلی دلائل کی اعلیٰ شکل بھی خیال کیا جاتا تھا اور ارسطو اپنے شاگردوں کو منطق کی تعلیم دیتے وقت خصوصیت سے ''عقلی دلائل کے ذریعے زمین کو گول ثابت کرنے'' کی تربیت دیا کرتا تھا۔

چاند کی روشنی

محترم ذاکر نائیک نے چاند کی روشنی پر بحث کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ قدیم تہذیبوں میں ''یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ چاند اپنی روشنی خود خارج کرتا ہے۔'' اگرچہ یہاں پر انہوں نے واضح الفاظ میں یہ دعویٰ تو نہیں کیا کہ چاند کی روشنی کے منعکس شدہ روشنی ہونے کی بابت پہلے پہل قرآن پاک ہی نے بتایا ہے، لیکن اندازِ بیان کچھ اسی طرح کا ہے۔

تاہم، زمین کی کروی ساخت کا تاریخی جائزہ پیش کرتے ہوئے ہم دیکھ چکے ہیں کہ چاند کے ازخود روشن نہ ہونے کے بارے میں بھی قبل مسیح کے زمانے سے معلومات موجود تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو چاند گرہن کے موقع پہ چاند کی سطح پر زمین کے سائے کو ارسطو اپنے دلائل میں ہرگز کوئی جگہ نہ دیتا۔

چاند کی روشنی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے محترم ذاکر نائیک نے لکھا ہے کہ ''سورج میں ''احتراق (Combustion) کا زبردست عمل جاری رہنے کی وجہ سے شدید حرارت اور توانائی خارج ہوتی رہتی ہے۔'' یہ بھی ایک بڑی غلط فہمی ہے، جس کا ازالہ ان شاء اللہ کچھ سطور بعد کیا جائے گا۔

سورج کی حرکت اور ''ساکن جگہ''

''سورج گھومتا ہے'' کے ذیلی عنوان کے تحت جناب ذاکر نائیک نے یہ بتایا ہے کہ

سورج بھی ساکن نہیں اور یہ ۲۴۰ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کرتے ہوئے تقریباً ۲۰ کروڑ سال کی مدت میں ہماری ملکی وے کہکشاں کے گرد اپنا ایک چکر مکمل کر لیتا ہے۔

پھر ایک آیت مبارکہ کا حوالہ دینے کے بعد لکھتے ہیں:

''وہ ساکن جگہ (Fixed Place) جس کی سمت ہمارا سورج اپنے تمام تر نظام (نظامِ شمسی) سمیت عازمِ سفر ہے، جدید فلکیات کی بدولت ٹھیک ٹھیک شناخت کر لی گئی ہے۔ اسے سولر اپیکس (Solar apex) کا نام دیا گیا ہے۔ پورا نظامِ شمسی درحقیقت خلا میں اسی مقام کی سمت حرکت کر رہا ہے جو ہرکولیس نامی جھرمٹ (ایلفا لیرائی) میں واقع ہے اور جس کی درست جگہ آج ہمیں معلوم ہو چکی ہے۔''

کاش کہ محترم مصنف نے اس قدر اہم موضوع پر قلم اُٹھانے سے پہلے کسی ماہر فلکیات سے رہنمائی لے لی ہوتی تو وہ اپنے ہی دلائل میں تضاد کا شکار نہ ہوتے۔ ایک عام قاری جب تسلسل سے ان دونوں بیانات کو پڑھتا ہے تو وہ اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ وہ کس بات کو صحیح تسلیم کرے؟ سورج کے ملکی وے کہکشاں کے گرد چکر لگانے کو یا ''سولر اپیکس'' نامی ''ساکن جگہ'' کی سمت حرکت کرنے کو؟ ذیل میں ہم اسی اُلجھن کو رفع کرنے کی کوشش کریں گے:

الف یہ بات درست ہے کہ سورج، ملکی وے کہکشاں کا ایک ستارہ ہے اور یہ تقریباً ۲۳۰ کلو میٹر فی سیکنڈ (یعنی تقریباً ۸۳۰،۰۰۰ کلو میٹر فی گھنٹہ) کی رفتار سے کہکشانی مرکز (Galactic Center) کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ سورج، کہکشانی مرکز کے گرد اپنا ایک چکر تقریباً ۲۲ کروڑ سال میں پورا کر لیتا ہے۔

ب محترم مصنف نے ہرکولیس برج اور ایلفا لیرائی (یا لاٹرائی) کو بڑی سادگی سے ایک کر دیا ہے، حالانکہ یہ دونوں الگ الگ ہیں۔ آسمانی بروج میں ہرکولیس کو شکاری کی شکل والے برج سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ یونانی دیو مالا میں ہرکولیس ایک فاتح دیوتا ہوا کرتا تھا اور اسی مناسبت سے یہ برج ''ہرکولیس'' کہلاتا ہے۔ اسی برج میں ''ہرکولیس'' نام کا جھرمٹ (Cluster) بھی ہے جو زمین سے تقریباً ۲۱،۰۰۰ نوری سال دور

ہے۔ (یعنی وہاں سے چلنے والی روشنی کو زمین تک پہنچنے میں اکیس ہزار سال لگ جاتے ہیں!) ہرکولیس جھرمٹ کی چوڑائی تقریباً ۱۰۰ نوری سال ہے اور ماہرین فلکیات نے اندازہ لگایا ہے کہ اس جھرمٹ میں کم از کم دس لاکھ ستارے ہیں۔ یہی بات اس جھرمٹ کو ممتاز کرتی ہے۔ ہرکولیس نام کا ایک کہکشانی جھرمٹ (Galactic Cluster) بھی ہے جس میں سیکڑوں کہکشائیں ہیں- یہ کہکشانی جھرمٹ، زمین سے ۷۰ کروڑ نوری سال دور ہے۔

ج جہاں تک ایلفا لیرائی کا معاملہ ہے تو اس کا ہرکولیس برج اور ہرکولیس جھرمٹ، دونوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سورج سے کہیں زیادہ کمیت رکھنے والا ایک ستارہ ہے جو زمین سے ۲۵ نوری سال دوری پر واقع ہے۔ اس کا زیادہ مشہور نام ''ویگا'' ہے۔ اور اسے ''ایلفا لیرائی'' اس لیے بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ لائرا (Lyra) یا لیرا نامی جھرمٹ میں واقع ہے۔

د خلاء میں کوئی ''ساکن جگہ'' (Fixed Place) نہیں ہے کیونکہ کائنات کی ہر شے دوسری اشیا کی مناسبت سے حرکت میں ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ فاضل مصنف تک ساکن جگہ والی بات کس نے، اور کیسے پہنچائی ہے؟

ھ محترم مصنف کے پیرایہ بیان سے یوں لگتا ہے کہ جیسے سورج اپنے سارے نظام (نظامِ شمسی) سمیت اکیلا ہی کسی سمت حرکت کر رہا ہے اور باقی کے اجرامِ فلکی وہیں پر ہیں۔

اتنا سب کچھ بتا دینے کے بعد اب ہم ان سائنسی حقائق کی طرف آتے ہیں جنہیں جدید فلکیات میں قبولیت عام کا درجہ حاصل ہے:

عشرہ ۱۹۸۰ء کے اواخر میں سات ماہرین فلکیات پر مبنی ایک تحقیقی ٹیم نے طویل فلکیاتی مطالعات کے بعد ایک عجیب وغریب انکشاف کیا۔ (اس ٹیم کی سربراہی ماؤنٹ ولسن رصدگاہ کے ایلن ڈریسلر، بک رصدگاہ کی سینڈرا فیبر، اور کیمبرج یونیورسٹی کے ڈونالڈ لنڈن بیل کر رہے تھے) ان ماہرین نے دریافت کیا کہ ملکی وے کہکشاں اور اس کی پڑوسی ''اینڈرومیڈا'' کہکشاں، چالیس کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے مقامی گروہ (لوکل گروپ) کے مرکز کی طرف

بڑھ رہی ہیں۔ (لوکل گروپ سے مراد لگ بھگ بیس کہکشاؤں پر مشتمل ایک چھوٹا سا کہکشانی جھرمٹ ہے ہماری کہکشاں یا ملکی وے، اسی جھرمٹ میں شامل ہے) دوسری دریافت انہوں نے یہ کی کہ لوکل گروپ اور سنبلہ (Virgo) نامی کہکشانی جھرمٹ (جسے اس تناظر میں لوکل گروپ کا پڑوسی کہنا زیادہ صحیح ہوگا) تقریباً ۶۰۰ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے ''ہائیڈرا سینڈراس'' (Hydra Centaurus) نامی ایک بہت بڑے کہکشانی جھرمٹ (سپر کلسٹر) کی طرف حرکت کر رہے ہیں۔ جبکہ ہائیڈرا سینٹارس خود بھی اسی سمت میں، اسی رفتار سے حرکت کر رہا ہے کہ جس سمت میں ورگو کہکشانی جھرمٹ جا رہا ہے۔

اسے ہم یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ لوکل گروپ، ورگو اور ہائیڈرا سینٹارس، تینوں کے تینوں ایک یکجا وجود (Single entity) کی حیثیت سے ۶۰۰ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے ایک سمت بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اُس سمت میں کوئی نادیدہ شے ہے جو انہیں کسی عظیم کشش گر (Great attractor) کی طرح انہیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس مجموعے میں ہماری ملکی وے کہکشاں بھی شامل ہے، اور ہمارا سورج اسی کہکشاں کا ایک ستارہ ہے۔ لہٰذا وہ بھی ساتھ ساتھ حرکت کر رہا ہے۔

اُمید ہے کہ ان تمام وضاحتوں کے بعد قارئین کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔

سورج ''بجھ'' جائے گا

سورج کے بجھ جانے کا تذکرہ کرتے ہوئے محترم ذاکر نائیک نے لکھا ہے کہ سورج کی روشنی ''ایک کیمیائی عمل کا نتیجہ جو اس کی سطح پر گزشتہ پانچ ارب سال سے جاری ہے'' یہ ایک ایسا جملہ ہے جو سائنس، خصوصاً نیوکلیائی و فلکی طبیعات سے عمومی واقفیت رکھنے والے کسی بھی قاری کو بے چین کرنے کے لیے کافی ہے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ جب دلیل پیش کرنے والے کی عدم واقفیت کا یہ حال ہے تو اس کے دلائل پر بھروسہ کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ ایسا ہونا قرین قیاس بھی ہے، کیونکہ اس سے پہلے جناب ذاکر نائیک، چاند کی روشنی کا تذکرہ کرتے ہوئے سورج کی روشنی کو ''عمل احتراق'' (Combustion) کا حاصل قرار دے چکے ہیں۔ ہر چند

کہ اس غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے نیوکلیائی طبیعات پر طویل بحث کی ضرورت ہے، لیکن یہاں ہم اختصار کے نقطہ نگاہ سے صرف چند ضروری نکات ہی کو بیان کرنے پر اکتفا کریں گے:

☆ سورج کی سطح کا اوسط درجہ حرارت تقریباً ۵۰۰،۵ ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ اس درجہ حرارت پر ایٹم اپنے سارے کے سارے الیکٹرانوں سے محروم ہو چکے ہوتے ہیں اور ان کے صرف مرکزے (Nucleii) ہی باقی رہ جاتے ہیں۔

☆ عمل احتراق (Combustion) ایک کیمیائی عمل ہے۔

☆ کوئی بھی کیمیائی عمل اس وقت ہوتا ہے جب کہ ایٹموں کے درمیان الیکٹرونوں کا تبادلہ (Exchange) عمل میں آتا ہے۔ کیمیائی تعاملات (Chemical reactions) ہی کے نتیجے میں مرکبات بنتے، ٹوٹتے اور اپنی حالت تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ایٹم الیکٹرونوں ہی سے محروم ہو جائے تو اس کے پاس صرف مرکزہ رہ جائے گا۔ ایسی صورت میں کوئی کیمیائی عمل ممکن نہیں۔ سورج کے ضمن میں بھی یہی بات درست ہے۔

☆ احتراق وہ کیمیائی عمل ہے جس کے دوران بلند درجہ حرارت پر کوئی چیز (مثلاً کوئلہ لکڑی، پیٹرول یا گیس وغیرہ) آکسیجن کے ساتھ کیمیائی تعامل کرتی ہے اس عمل کے نتیجے میں جہاں کوئی دوسرا کیمیائی مادہ (مثلاً راکھ) بنتا ہے، وہاں اس عمل کے دوران حرارت خارج ہوتی ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ بھی بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہوا کی موجودگی میں (کہ جس میں ۲۱ فیصد آکسیجن شامل ہوتی ہے) کسی چیز کے جلنے کا عمومی عمل بھی احتراق ہی کہلاتا ہے۔ اگر کوئی چیز آکسیجن کی عدم موجودگی میں "جلائی" جائے (جیسا کہ فاضل مادے جلانے والی، خاص طرح کی بھٹیوں میں ہوتا ہے) تو اس کیمیائی عمل کو Inceneration کہا جاتا ہے، جس کا لغوی ترجمہ جل کر بھسم ہو جانا یا جلا کر راکھ کر دینا ہے، لیکن جب یہی لفظ بطورِ اصطلاح استعمال کیا جائے تو اس کا مطلب کسی چیز کو آکسیجن کی عدم موجودگی میں (یا بہت ہی کم آکسیجن کی موجودگی میں) اس طرح جلانا کہ صرف راکھ باقی رہ جائے۔

☆ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سورج کی سطح پر کوئی کیمیائی عمل ممکن ہی نہیں، کیونکہ اوّل تو وہاں ہائیڈروجن ہوتی ہے، اور دوم کہ ہائیڈروجن بھی کیسی حالت میں نہیں ہوتی بلکہ "پلازما" حالت میں ہوتی ہے۔ یعنی ہائیڈروجن شدید گرم ہوتی ہے اور اس کے ایٹم اپنے الیکٹرونوں سے محروم ہو چکے ہوتے ہیں۔ جب ایٹموں میں الیکٹرون ہی نہیں تو کیمیائی عمل کیسے ممکن ہے؟

☆ اس کے برعکس، حقیقت یہ ہے کہ سورج پر "گدافت" (فیوژن) کہلانے والا نیوکلیائی عمل ہر وقت جاری رہتا ہے۔ یہی وہ عمل ہے جو ہائیڈروجن بم میں واقع ہوتا ہے اور زمین پر شدید تباہی پھیلاتا ہے۔ کیونکہ اس عمل میں زبردست حرارت خارج ہوتی ہے، اس لیے یہ طبیعات کی اصطلاح میں "جوہری تعامل" (تھرمونیوکلیئرری ایکشن) بھی کہلاتا ہے۔ اسی مناسبت سے ہائیڈروجن بم کا صحیح سائنسی نام "تھرمونیوکلیئر ڈیوائس" بھی لیا جاتا ہے۔ سورج کی بات کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ سورج کی سطح پر "ہر لمحے کروڑوں ہائیڈروجن بم پھٹتے رہتے ہیں" تو اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ سورج پر زبردست جوہری تعامل ہر وقت جاری رہتا ہے۔

☆ سورج پر ہمہ وقت جاری جوہری تعامل یا تھرمونیوکلیئرری ایکشن میں ہائیڈروجن کے چار مرکزے آپس میں ملتے ہیں اور ہیلیم کا ایک مرکزہ بناتے ہیں۔ اس عمل سے زبردست توانائی خارج ہوتی ہے جس میں حرارت اور روشنی کی شکل رکھنے والی توانائی بھی شامل ہوتی ہے۔ سورج کی حیات بخش حرارت اور روشنی بھی وہاں بہت بڑے پیمانے پر جاری، اسی عمل کی مرہونِ منت ہے نہ کہ کسی کیمیائی عمل کا حاصل۔

قصہ مختصر یہ کہ سورج پر گدافت (فیوژن) کا نیوکلیائی عمل ہوتا ہے اور یہی عمل سورج کو گزشتہ تقریباً پانچ ارب سال سے گرم اور روشن رکھے ہوئے ہے۔

اسی موضوع پر بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے جناب ذاکر نائیک لکھتے ہیں کہ مستقبل میں "کسی موقع پر یہ عمل بھی رُک جائے گا، اور تب سورج بھی مکمل طور پر بجھ جائے گا۔"

بلاشبہ، مستقبل میں ایسا ضرور ہوگا، لیکن فاضل مصنف یہ بتانا ہی بھول گئے کہ ماہرین فلکیات کے مطابق، ایسا آج سے تقریباً پانچ ارب سال بعد ہوگا، قائل کرنے کے لیے دلائل دینے کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن جب معاملہ نازک اور حساس ہو تو دلائل کے چھوٹے چھوٹے پہلوؤں میں بھی درستگی سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔

بصد معذرت، حرفِ آخر

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ قرآن پاک کا پیغام ساری دنیا اور رہتی دنیا کے لیے ہے۔ لیکن جب دوسروں، خصوصاً غیر مسلموں پر قرآن پاک کی حقانیت ثابت کرنے کا معاملہ ہو تو جہاں ہم دیگر اُمور میں خود کو متنوع دلائل سے لیس کرتے ہیں، وہیں ہمیں سائنسی دلائل پر بھی پوری تندہی اور توجہ سے کام کرنا چاہیے۔

اگر ہماری تحقیق اور توجہ میں کچھ کمی رہ گئی تو اس سے قرآن پاک کی سچائی میں تو سرِ مُو فرق نہیں آئے گا، البتہ ہم ان لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچانے میں مناسب طور پر کامیاب نہیں ہو سکیں گے، جن تک اس دعوت کا صحیح طور پر پہنچنا اشد ضروری ہے۔ ہم نے یہ تبصرہ پوری دیانت داری سے مرتب کیا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ معلومات کی درستگی کو بھی بطورِ خاص ملحوظ رکھا ہے۔ اگر قارئین ہمارے پیش کردہ نکات کی مزید تفصیلات جاننا چاہیں، تو اس کے لیے ہم اُن کتب کی فہرست بھی دے رہے ہیں جن سے ہم نے اس دوران استفادہ کیا ہے، اور معلومات کی تصدیق بھی کی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کا صحیح فہم عطا فرمائے، اسلام کی تعلیمات پر درست طریقے سے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ہمارے ناقص علم کو اپنی راہ میں قبول فرمائے۔ (آمین)

علیم احمد (کراچی)
۲۱ر ذیقعدہ ۱۴۲۶ ہجری
بمطابق ۲۴ دسمبر ۲۰۰۵ء

حوالہ جات

1. Shadows of creation: Dark Matter and the structure of the Universe, Michael Riordan & David N. Schramm, W.H Freeman and Company, 1991.
2. Space Facts, Susan Goodman, Oxford University Press,1993.
3. Introductory Astronomy & Astrophysics, Zeilik & Smith, Sounders College Publishing,1987.
4. Theory of Everything: The Origin and Fate of the Universe, Stephen W. Hawking, New Millennium press,2002.
5. Astronomy: The Definitine Guide, Robert Burnham , Alan Dyer, Jeff Kanipe, Barnes & Noble Books, 2003.
6. Discovering the Universe, W.J. KoufmannIII, W.H. Freeman & Company, 1993.
7. Mc Graw-Hill Dictionary of Scientific and Technical Terms, 2003.
8. Dictionary of Science and Technology, Simon Collin, Bloons Bury Publishing, 2003.
9. The New Penguin Encyclopedia 2003.

تعارف

جب سے اس سیارہ زمین پر نوعِ انسانی کا ظہور ہوا ہے، تب سے انسان نے ہمیشہ یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ نظامِ فطرت (نظامِ قدرت) کیسے کام کرتا ہے، تخلیقات ومخلوقات کے تانے بانے میں اس کا اپنا مقام کیا ہے اور یہ کہ آخر خود زندگی کا کیا مقصد ومصرف ہے۔ سچائی کی اسی تلاش میں، جو صدیوں کی مدت اور متنوع تہذیبوں پر پھیلی ہوئی ہے، منظم مذاہب نے انسانی طرزِ حیات کی تشکیل کی ہے اور، ایک وسیع تر تناظر میں تاریخ کے دھارے کا تعین بھی کیا ہے۔ بعض مذاہب کی بنیاد تحریر شدہ عبارات وفرمودات پر رہی ہے، جن کے بارے میں ان کے پیروکاروں کا دعویٰ ہے کہ وہ خدائی یا الوہی ذرائع سے ملنے والی تعلیمات کا حاصل ہیں، جبکہ بعض دیگر مذاہب کا دارومدار خالصتاً انسانی تجربے پر رہا ہے۔

قرآن پاک، جو اسلامی عقیدے کا مرکزی ماخذ بھی ہے، ایک ایسی کتاب ہے جسے (اسلام کی) پیروی کرنے والے لوگ، یعنی مسلمان، مکمل طور پر خدائی یا الوہی (یا آسمانی) ذرائع سے نازل شدہ تسلیم کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں، قرآن پاک کے بارے میں مسلمانوں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ اس میں رہتی دنیا تک تمام بنی نوع انسان کے لیے ہدایت موجود ہے۔ چونکہ قرآن پاک کا پیغام ہر زمانے، ہر عہد اور ہر دَور کے لوگوں کے لیے ہے، لہٰذا اسے ہر دور کی مطابقت میں ہونا چاہیے۔ لیکن کیا قرآن پاک اس کسوٹی پر پورا اُترتا ہے؟

اس مختصر سی کتاب میں مسلمانوں کے اس عقیدے کا خارجی تجزیہ (Objective analysis) پیش کیا جائے گا جو وہ قرآن پاک کے الہامی ذریعے سے ہونے کے بارے میں رکھتے ہیں۔ اس امر کا جائزہ بطورِ خاص ثابت شدہ سائنسی دریافتوں کی روشنی میں پیش کیا جائے گا۔

انسانی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب ''معجزہ'' یا وہ چیز جو معجزہ تصور کی جاتی تھی،

اپنے زمانے کے انسانی علم، دلیل اور منطق سے آگے ہوا کرتی تھی۔معجزے کی عمومی تعریف بھی یہی ہے کہ ایسی کوئی چیز جو عام انسانی زندگی کے برخلاف ہو اور جس کی عقلی وضاحت انسان کے پاس نہ ہو۔

تاہم، کسی بھی چیز کو معجزے کے طور پر قبول کرنے سے پہلے ہمیں بہت محتاط ہونا پڑے گا۔ مثلاً ۱۹۹۳ء میں "ٹائمز آف انڈیا" بمبئی میں ایک خبر شائع ہوئی، جس میں "بابا پائلٹ" نامی ایک سادھو نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ پانی سے بھرے ایک ٹینک میں لگاتار تین دن اور تین راتوں تک زیرِآب رہا ہے۔البتہ جب رپورٹروں نے اُس ٹینک کی تہہ کا جائزہ لینے کی کوشش کی جس میں اس نے یہ "معجزاتی کارنامہ" دکھایا تھا تو اس نے انہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔جوابی دلیل کے طور پر اس نے صحافیوں سے یہ کہا کہ کسی کو یہ اجازت کیسے دی جا سکتی ہے کہ وہ رحمِ مادر (Womb) کا تجزیہ کرے کہ جس سے بچہ جنم لیتا ہے۔صاف ظاہر ہے کہ "سادھو جی" کچھ نہ کچھ چھپانا چاہ رہے تھے! اُن کا یہ دعویٰ محض شہرت حاصل کرنے کی ایک چال تھی۔یقیناً جدید دور کا کوئی بھی شخص جو معقولیت پسندانہ سوچ (Ratinonal Thinking) کی جانب تھوڑا سا رجحان بھی رکھتا ہو گا، ایسے کسی نام نہاد "معجزے" کو قبول نہیں کرے گا۔اگر ایسے جھوٹے اور بے بنیاد معجزے ہی "من جانب اللہ" ہونے کا پیمانہ ہیں تو (نعوذ باللہ) ہمیں دنیا کے سارے مشہور جادوگروں کو جن کی وجہِ شہرت ہی ان کے شعبدے اور بصری دھوکے ہیں، خدا کے اصل نمائندوں کے طور پر قبول کرنا پڑے گا۔

ایک ایسی کتاب جس کے آسمانی ذریعے سے نازل شدہ (یعنی من جانب اللہ) ہونے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے، اسی بنا پر ایک معجزہ ہونے کی دعویدار بھی ہے۔اس دعوے کو کسی بھی زمانے میں اُسی زمانے کے (عقلی) معیارات کی مطابقت میں باآسانی قابلِ توثیق (Verifiable) ہونا چاہیے۔مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری اور حتمی کتاب ہے، جو تمام تر معجزات سے بھی بڑھ کر معجزہ ہے، جسے بنی نوعِ انسان کی فلاح کے لیے نازل کیا گیا ہے۔لہٰذا اب ہم اس عقیدے کی درستگی کا عقلی جائزہ لیتے ہیں۔

قرآن پاک کا چیلنج:

تمام تہذیبوں میں انسانی قوتِ بیان اور تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے اہم ذرائع میں ادب اور شاعری سرِفہرست رہے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے زمانے بھی گزرے ہیں جب شاعری اور ادب کو (معاشرے میں) ویسا ہی اعلیٰ وارفع مقام حاصل تھا جیسا کہ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کو حاصل ہے۔

غیر مسلم ماہرین لسانیات تک کا اس پر اتفاق ہے کہ عربی ادب کا سب سے بلند پایہ نمونہ قرآن پاک ہی ہے، یعنی اس روئے زمین پر عربی ادب کی بہترین سے بھی کہیں بڑھ کر بہترین مثال صرف قرآن پاک ہے۔ نوعِ انسانی کو قرآن پاک کا چیلنج ہے کہ وہ آیاتِ قرآنی کے ہم پلہ کچھ بنا کر دکھائے۔

﴿ وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴾ (القرآن: سورة ۲، آیت ۲۳ تا ۲۴)

''اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہو کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اُتاری ہے، یہ ہماری ہے یا نہیں تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر دکھاؤ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے، تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر۔ جو مہیا کی گئی ہے منکرین حق کے لیے۔''

قرآن پاک واضح الفاظ میں (تمام انسانوں کو) چیلنج کر رہا ہے کہ وہ ویسی ہی ایک سورۃ بنا کر تو دکھائیں جیسی کہ قرآن پاک میں موجود ہیں یہ چیلنج قرآن پاک میں کئی مقامات پر دیا گیا ہے۔ صرف ایک ایسی سورۃ بنانے کا چیلنج، جو اپنی خوبصورتی، خوش بیانی، معانی کی وسعت

اور فکر کی گہرائی میں قرآن پاک کی برابری کر سکے، آج تک پورا نہیں کیا جا سکا ہے۔

تاہم جدید دور کا معقولیت پسند آدمی ایسے کسی مذہبی صحیفے کو قبول نہیں کرے گا، جو بہترین ادبی و شاعرانہ زبان استعمال کرنے کے باوجود یہ کہتا ہو کہ زمین چپٹی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ہم ایک ایسے زمانے میں جی رہے ہیں جہاں انسان کے عقلی دلائل، منطق اور سائنس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو قرآن پاک کے من جانب اللہ ہونے کے ثبوت میں اس کی غیر معمولی اور بلند پایہ ادبی زبان کو بطور ثبوت کافی خیال نہیں کریں گے۔ کوئی بھی ایسا صحیفہ، جو آسمانی (اللہ کی طرف سے) ہونے کا دعویدار ہو، اسے اپنے دلائل اور منطق استدلال کی مضبوطی کی بنیاد پر بھی قابلِ قبول ہونا چاہیے۔

مشہور ماہر طبیعیات اور نوبل انعام یافتہ سائنسدان البرٹ آئن اسٹائن کے بقول "مذہب کے بغیر سائنس لنگڑی ہے۔ سائنس کے بغیر مذہب اندھا ہے۔" لہٰذا اب ہم قرآن پاک کا جائزہ لیتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا جدید سائنس اور قرآن پاک میں باہمی مطابقت ہے یا عدم مطابقت؟

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ قرآن پاک کوئی سائنسی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ یہ "نشانیوں" (Signs) کی کتاب ہے۔ یعنی آیات کی کتاب ہے۔ قرآن پاک میں چھ ہزار سے زاید "نشانیاں" (آیات) ہیں، جن میں ایک ہزار سے زاید خالصتاً سائنس سے (یعنی سائنسی موضوعات سے) بحث کرتی ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ کئی مواقع پر سائنس "یوٹرن" لیتی ہے (یعنی سابقہ موقف کے بالکل اُلٹ بات کہنے لگتی ہے) لہٰذا میں نے اس کتاب میں صرف اور صرف تسلیم شدہ (ثابت شدہ) سائنسی حقائق ہی کو منتخب کیا ہے جب کہ ایسے تصورات و نظریات پر بات نہیں کی ہے جو محض مفروضات ہوں یا جن کی پشت پر کوئی (سائنسی) ثبوت نہ ہو۔

فلکیات

کائنات کی تخلیق: ''بگ بینگ''

فلکی طبیعیات کے ماہرین ابتدائے کائنات کی وضاحت ایک ایسے مظہر (Phenomenon) کے ذریعے کرتے ہیں جسے وسیع طور پر قبول کیا جاتا ہے۔اور جس کا جانا پہچانا نام'' بگ بینگ''(Big Bang) ہے۔بگ بینگ کے ثبوت میں گزشتہ کئی عشروں کے دوران مشاہدات وتجربات کے ذریعے ماہرین فلکیات وفلکی طبیعیات کی جمع کردہ معلومات موجود ہیں۔ بگ بینگ نظریے کے مطابق ابتدا میں یہ ساری کائنات ایک بڑی کمیت (Primary Nebula) کی شکل میں تھی۔پھر ایک عظیم دھماکہ یعنی'' بگ بینگ'' (Secondary Separation) ہوا جس کا نتیجہ کہکشاؤں کی شکل میں ظاہر ہوا۔پھر یہ کہکشائیں تقسیم ہو کر ستاروں، سیاروں، سورج، چاند وغیرہ کی صورت میں آ گئیں۔کائنات کی ابتداء اس قدر منفرد اور اچھوتی تھی کہ'' اتفاق''(Chance) سے اس کے وجود میں آنے کا احتمال (Probability) صفر (کچھ بھی نہیں) تھا۔

قرآن پاک کی درج ذیل آیات میں ابتدائے کائنات کے متعلق بتایا گیا ہے:

﴿ اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ﴾ (القرآن:سورۃ ۲۱ آیت،۳۰)

''کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبی ﷺ کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا۔''

اس قرآنی آیت اور'' بگ بینگ'' کے درمیان حیرت انگیز مماثلت سے انکار ممکن ہی

نہیں! یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک کتاب جو آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے عرب کے ریگستانوں میں ظاہر ہوئی، اپنے اندر ایسی غیر معمولی سائنسی حقیقت لیے ہوئے ہو؟

کہکشاؤں کی تخلیق سے پہلے، ابتدائی گیسی کمیت

سائنسدان اس پر متفق ہیں کہ کائنات میں کہکشائیں بننے سے بھی پہلے، کائنات کا سارا مادہ ایک ابتدائی گیسی حالت میں تھا، مختصر یہ کہ کہکشاؤں کی تشکیل سے پہلے، وسیع وعریض (گیسی) بادلوں کی شکل میں وہ مادہ موجود تھا جسے کہکشاؤں کی شکل میں آنا تھا۔ اس ابتدائی کائناتی مادے کی وضاحت میں گیس سے زیادہ موزوں لفظ ''دھواں'' ہے۔ درج ذیل آیت قرآن میں کائنات کی اسی حالت کا حوالہ ''دخان'' یعنی دھوئیں کا لفظ استعمال کر کے دیا گیا ہے۔

﴿ ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴾

(القرآن: سورة ۴۱، آیت ۱۱)

''پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا، اس نے آسمان اور زمین سے کہا: ''وجود میں آ جاؤ، خواہ تم چاہو، یا نہ چاہو'' دونوں نے کہا: ہم آ گئے فرماں برداروں کی طرح۔''

ایک بار پھر، یہ حقیقت بھی ''بگ بینگ'' کی عین مطابقت میں ہے جس کے بارے میں حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت سے پہلے کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔ (بگ بینگ کا نظریہ بیسویں صدی کی یعنی عہدِ نبویؐ کے ۱۳۰۰ سال بعد کی پیداوار ہے، مترجم) اگر اس زمانے میں کوئی بھی اس سے واقف نہیں تھا تو پھر اس علم کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے؟

زمین کی کروی (گولا نما یا Spherical) ساخت

ابتدائی زمانوں کے لوگ یہ یقین رکھتے تھے کہ زمین چپٹی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں تک انسان صرف اسی وجہ سے دُوردراز کا سفر کرنے سے خوفزدہ رہا کہ کہیں وہ زمین کے

کناروں سے گر نہ پڑے! سر فرانسس ڈریک وہ پہلا آدمی تھا جس نے ۱۵۹۷ء میں زمین کے گرد (سمندر کے راستے) چکر لگایا اور عملاً یہ ثابت کیا کہ زمین گول (کروی) ہے۔

یہ نکتہ ذہن میں رکھتے ہوئے ذرا درج ذیل قرآنی آیت پر غور فرمایئے جو دن اور رات کے آنے اور جانے سے متعلق ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ﴾

(القرآن: سورۃ ۳۱، آیت ۲۹)

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں۔''

یہاں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رات کے بتدریج دن میں ڈھلنے، اور دن کے بتدریج رات میں ڈھلنے کا تذکرہ فرمایا ہے۔ یہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب زمین کی ساخت کسی گولے جیسی یعنی کروی ہو۔ اگر زمین چپٹی ہوتی تو دن کی رات میں یا رات کی دن میں تبدیلی بالکل اچانک ہوتی۔ ذیل میں ایک اور آیت مبارک ملاحظہ ہو۔ اس میں بھی زمین کی کروی ساخت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ ﴾ (القرآن: سورۃ ۳۹، آیت ۵)

''اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔''

یہاں استعمال کیے گئے عربی لفظ ''کوّر'' کا مطلب ہے کسی ایک چیز کو دوسری پر منطبق (Overlap) کرنا یا (ایک چیز کو دوسری چیز پر) چکر دے کر (کوائل کی طرح) باندھنا دن اور رات کو ایک دوسرے پر منطبق کرنا یا ایک دوسرے پر چکر دینا صرف اسی وقت ممکن ہے جب زمین کی ساخت کروی ہو۔

زمین کسی گیند کی طرح بالکل ہی گول نہیں بلکہ ''ارضی کروی'' (Geo-Sperical)

15768

ہے، یعنی قطبین (Poles) پر سے تھوڑی سے پچکی ہوئی ہے۔ درج ذیل آیت مبارک میں زمین کی ساخت کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے:

﴿ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ﴾ (القرآن: سورۃ ۷۹، آیت ۳۰)

"اور پھر زمین کو اس نے بچھایا۔"

یہاں عربی عبارت " دَحٰهَا" استعمال ہوئی ہے جس کا مطلب ہے "شتر مرغ کا انڈا" شتر مرغ کے انڈے کی شکل، زمین کی ارضی کروی ساخت ہی سے مشابہت رکھتی ہے۔ پس یہ ثابت ہوا کہ قرآن پاک میں زمین کی ساخت بالکل ٹھیک بیان کی گئی ہے، حالانکہ نزولِ قرآنِ پاک کے وقت مقبول عام تصور یہی تھا کہ زمین چپٹی ہے۔

چاند کی روشنی، منعکس شدہ روشنی ہے

قدیم تہذیبوں میں یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ چاند اپنی روشنی خود خارج کرتا ہے (یعنی از خود روشن ہے) سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ چاند کی روشنی، منعکس شدہ روشنی ہے۔ تاہم یہ حقیقت آج سے چودہ سو سال پہلے، قرآن پاک کی درج ذیل آیت مبارکہ میں بیان کر دی گئی ہے:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ﴾ (القرآن، سورۃ ۲۵، آیت ۶۱)

"بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔"

قرآن پاک میں سورج کے لیے عربی لفظ "شمس" استعمال ہوا ہے۔ البتہ اسے (سورج کو) "سراج" بھی کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب ہے مشعل (ٹارچ) جب کہ بعض مواقع پر اسے "وہاج" بمعنی جلتا ہوا چراغ یا جلتا ہوا دیا کے الفاظ میں بھی بیان کیا گیا ہے جس کا مفہوم "چمکتی ہوئی شان و عظمت" ہے مذکورہ تینوں وضاحتیں سورج کے لیے بالکل مناسب ہیں کیونکہ اس کے اندر احتراق (Combustion) کا زبردست عمل ہر وقت جاری رہنے کی وجہ سے شدید حرارت اور روشنی خارج ہوتی رہتی ہے۔

چاند کے لیے قرآن پاک میں عربی لفظ ''قمر'' استعمال کیا گیا ہے اور اسے بطور ''منیر'' بیان کیا گیا ہے ایک ایسا جسم جو ''نور'' دیتا ہو۔یعنی منعکس شدہ روشنی دیتا ہو۔ایک بار پھر، قرآن پاک کی پیش کردہ وضاحت چاند کی اصل نوعیت سے پوری طرح میل کھاتی ہے کیونکہ، بلاشبہ، چاند کی اپنی کوئی روشنی نہیں ہے بلکہ یہ سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے، اور ہمیں روشن دکھائی دیتا ہے،قرآن پاک میں ایک مرتبہ بھی چاند کے لیے سراج ، وہاج یا دیا جیسے الفاظ استعمال نہیں ہوئے اور نہ ہی سورج کو نور یا منیر کہا گیا ہے،اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں سورج اور چاند کی روشنی کے درمیان بہت واضح فرق رکھا گیا ہے جو قرآن پاک میں آیات مبارکہ کے مطالعے سے واضح طور پر نظر آتا ہے۔

درج ذیل آیات میں سورج اور چاند کی روشنی کا فرق دیکھا جا سکتا ہے:

﴿ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا ﴾

(القرآن:سورۃ۱۰ ، آیت، ۵)

''وہی ہے جس نے سورج کو اُجالا بنایا اور چاند کو چمک دی۔''

﴿ اَلَمْ تَرَوْا كَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴾(القرآن:سورۃ۷۱ ، آیات ۱۵ تا ۱۶)

''کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہہ بر تہہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا۔''

اِن آیات مبارکہ کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن عظیم اور جدید سائنس میں دھوپ اور چاندنی کی ماہیت کے بارے میں مکمل اتفاق رائے ہے۔

سورج گھومتا ہے

ایک لمبے عرصے تک یورپی فلسفیوں اور سائنس دانوں کا یقین یہ رہا کہ زمین، کائنات مرکز میں ساکن کھڑی ہے اور سورج سمیت ، کائنات کی ہر چیز اس کے گرد چکر لگا رہی ہے یہ نظریہ جسے ارض ساکن یا ''ارض مرکزی نظریہ'' (جیوسینٹرک تھیوری) بھی کہا جاتا ہے،بطلیموس

کے زمانے (دوسری صدی قبل از مسیح) سے لے کر سولہویں صدی عیسوی تک سب سے زیادہ تسلیم کیا جانے والا ''سائنسی نظریہ'' رہا۔ پھر ۱۵۱۲ء میں نکولس کوپرنیکس نے سیاروی حرکت کا شمس مرکزی نظریہ (Heliocentric Theory of Planetary Motion) پیش کیا، جس میں یہ کہا گیا تھا کہ سورج، نظامِ شمسی کے مرکز میں ساکن ہے اور تمام سیارے اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ۱۶۰۹ء میں ایک جرمن سائنسدان، جوہانس کیپلر نے ''آسٹرونومیا نووا'' کے نام سے ایک کتاب شائع کروائی۔ اس کتاب میں کیپلر نے صرف یہی ثابت نہیں کیا کہ نظامِ شمسی کے سیارے بیضہ نما (Elliptical) مداروں میں سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ بلکہ اس نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ سیارے اپنے اپنے محوروں (Axes) پر غیر مستقل نوعیت کی رفتاروں سے گردش بھی کرتے ہیں۔ اس علم کی بدولت یورپی سائنسدانوں کے لیے نظامِ شمسی کے کئی ایک نظاموں کی درست وضاحت کرنی ممکن ہوگئی۔ بشمول رات اور دن کے تسلسل کے، ان دریافتوں کے بعد یہ سمجھا جانے لگا کہ سورج ساکن ہے اور زمین کی طرح اپنے محور پر گردش نہیں کرتا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے اسکول کے دنوں میں جغرافیہ کی کئی ایک کتابوں میں اسی غلط فہمی کا پرچار کیا گیا تھا۔ اب ذرا قرآن پاک کی درج ذیل آیت مبارکہ ملاحظہ فرمایئے:

﴿ وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۱، آیت ۳۳)

''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔''

غور فرمایئے کہ مذکورہ بالا آیت میں عربی لفظ " یَسْبَحُوْنَ " استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لفظ بذاتِ خود ''سبحا'' سے ماخوذ ہے، جس کے ساتھ ایک ایسی حرکت کا تصور وابستہ ہے جو کسی جسم کے متحرک ہونے سے پیدا ہوئی ہو۔ اگر آپ یہ لفظ زمین پر کسی شخص کے لیے استعمال کریں گے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ وہ لڑھک رہا ہے۔ بلکہ اس سے یہ مراد ہوگی کہ وہ شخص دوڑ رہا ہے یا چل رہا ہے۔ اگر یہ لفظ پانی میں کسی شخص کے لیے استعمال کیا جائے تو اس کا

مطلب یہ نہیں ہوگا کہ وہ (پانی پر) تیر رہا ہے بلکہ اس سے یہ مراد ہوگی کہ وہ شخص پانی میں تیراکی (Swimming) کر رہا ہے۔

اسی طرح جب آپ یہ لفظ "یُسَبِّح" کسی آسمانی جسم (جرم فلکی) سورج کے لیے استعمال کریں گے تو اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہوگا کہ وہ جسم خلا میں حرکت کر رہا ہے، بلکہ اس کا پورا مطلب کوئی ایسا جسم ہوگا جو خلا میں حرکت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے محور پر بھی گھوم رہا ہے۔ آج اسکولوں کی بیشتر نصابی کتابوں نے اپنی معلومات درست کرتے ہوئے یہ حقیقت شامل کر لی ہے۔ کہ سورج اپنے محور پر گردش بھی کر رہا ہے۔ سورج کی محوری گردش کی تصدیق کسی ایسے مشاہداتی ساز وسامان کی مدد سے بہ آسانی کی جاسکتی ہے جو سورج کا عکس کسی میز جتنی بڑی جگہ پر پھیلا کر دکھا سکے، اسی طرح نابینا پن کے خطرے سے دوچار ہوئے بغیر سورج کے عکس کا مشاہدہ کیا جا سکے گا۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ سورج کی سطح پر دھبے ہیں جو اپنا ایک چکر تقریباً پچیس دن میں مکمل کر لیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ سورج کو اپنے محور کے گرد ایک چکر پورا کرنے میں تقریباً پچیس دن لگ جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں سورج تقریباً ۲۴۰ کلومیٹر فی سیکنڈ (جی ہاں! ۲۴۰ کلومیٹر فی سیکنڈ) کی رفتار سے (اپنے سیاروں سمیت) خلا میں سفر کر رہا ہے۔ اس رفتار سے یہ تقریباً بیس کروڑ سال میں ہماری ملکی وے کہکشاں کے مرکز کے گرد اپنا ایک چکر مکمل کرتا ہے۔

﴿ لاَ الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلاَ الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۳۶، آیت ۴۰)

"نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جاسکتی ہے یہ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔"

یہ آیت مبارکہ ایک ایسی بنیادی اور اہم حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہے جسے جدید فلکیات نے قدرے حال ہی میں دریافت کیا ہے، یعنی چاند اور سورج کے انفرادی مداروں (Orbits) کی موجودگی اور حرکت کرتے ہوئے خلا میں ان کا سفر کرنا۔

وہ ''ساکن جگہ'' (Fixed Place) جس کی سمت ہمارا سورج اپنے تمام تر نظام (نظام شمسی) سمیت عازمِ سفر ہے۔ جدید فلکیات کی بدولت ٹھیک شناخت کر لی گئی ہے۔ اسے ''سولر ایپکس'' کا نام دیا گیا ہے پورا نظام شمسی درحقیقت خلا میں اس مقام کی سمت حرکت کر رہا ہے۔ جو ہرکولیس نامی برج (ایلفا لیرائی) میں واقع ہے اور جس کی درست جگہ آج ہمیں معلوم ہو چکی ہے۔

چاند اپنے محور پر اتنی ہی مدت میں گردش پوری کرتا ہے کہ جتنی دیر میں وہ زمین کے گرد ایک چکر پورا کرتا ہے۔ چاند کو اپنی ایک محوری گردش پوری کرنے میں تقریباً ۲۹،۵ دن لگ جاتے ہیں۔ قرآن پاک کی آیات مبارکہ میں سائنسی حقائق کی درستگی پر حیران ہوئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔ کیا ہمارے ذہنوں میں یہ سوال مچل نہیں اُٹھتا؛ ''قرآن میں پیش کیے گئے علم کا ماخذ، علم کا منبع آخر کیا ہے؟''

سورج بجھ جائے گا

سورج کی روشنی ایک کیمیائی عمل کی مرہونِ منت ہے جو اس کی سطح پر گذشتہ پانچ ارب سال سے جاری ہے۔ مستقبل میں کسی موقع پر یہ عمل رک جائے گا، اور تب سورج مکمل طور پر بجھ جائے گا جس کی وجہ سے زمین پر زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔ سورج کے وجود کی بے ثباتی کے بارے میں قرآن پاک فرماتا ہے:

﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِىْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾

(القرآن: سورۃ ۳۶، آیت ۳۸)

''اور سورج، وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے، یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔''

(نوٹ: کم و بیش اسی نوعیت کی باتیں قرآن پاک کی سورۃ ۱۳، آیت ۲؛ سورۃ ۳۵ آیت ۱۳؛ سورۃ ۳۹، آیت ۵؛ اور سورۃ ۳۹، آیت ۲۱ میں بھی بیان کی گئی ہیں۔) یہاں عربی لفظ ''مستقر'' استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے پہلے سے متعین کیا ہوا وقت یا جگہ یعنی اس آیت

مبارکہ میں اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ سورج پہلے سے طے شدہ ایک مقام کی طرف جا رہا ہے، اور یہ کہ وہ ایسا پہلے سے طے شدہ وقت کے مطابق ہی کرے گا۔ مطلب یہ کہ سورج بھی ختم ہو جائے گا، یا بجھ جائے گا۔

بین النجمی مادہ

پچھلے زمانوں میں منظم فلکیاتی نظاموں سے باہر کی خلا (بیرونی خلا) کو مکمل طور پر ''خالی خلا'' (Vacum) تصور کیا جاتا تھا بعدازاں ماہرین فلکی طبیعیات نے اسی خالی خلا یعنی بین النجمی خلا میں مادے کے پل (Bridges) دریافت کیے، مادے کے ان ''پلوں'' کو پلازما (Plasma) کہا جاتا ہے جو مکمل طور پر آئن شدہ (Ionized) گیس پر مشتمل ہوتے ہیں جس میں مثبت چارج والے آئن اور آزاد الیکٹرونوں کی مساوی تعداد ہوتی ہے۔ مادے کی تین جانی پہچانی حالتوں، یعنی ٹھوس، مائع اور گیس کو چھوڑ کر پلازما کو بسا اوقات مادے کی ''چوتھی حالت'' بھی کہا جاتا ہے۔ درج ذیل آیات مبارکہ میں قرآنِ پاک بین النجمی مادے (انٹر اسٹیلر میٹریل) کی جانب اشارہ کرتا ہے:

﴿ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ﴾

(القرآن، سورۃ ۲۵، آیت ۵۹)

''وہ جس نے چھ دنوں میں زمین اور آسمان اور ان ساری چیزوں کو بنا کر رکھ دیا جو آسمان وزمین کے درمیان ہیں۔''

کسی کے لیے بطور قیاس بھی یہ کہنا مضحکہ خیز ہوگا کہ بین النجمی کہکشانی مادے کی موجودگی آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے ہمارے علم میں تھی۔

پھیلتی ہوئی کائنات

۱۹۲۵ء میں امریکی ماہر فلکیات ایڈون ہبل نے اس امر کا مشاہداتی ثبوت فراہم کیا کہ تمام کہکشائیں ایک دوسرے سے دور ہٹ رہی ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ کائنات پھیل رہی ہے۔ کائنات پھیل رہی ہے یہ بات آج مسلمہ سائنسی حقائق میں شامل ہے ملاحظہ فرمایئے کہ

قرآنِ پاک میں کائنات کی ماہیت کے حوالے سے کیا ارشاد ہوا ہے:

﴿ وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴾

(القرآن: سورۃ ۵۱، آیت ۴۷)

''آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں (یا اسے وسعت دے رہے ہیں)''

عربی لفظ ''واسعون'' کا صحیح ترجمہ ''اسے پھیلا رہے ہیں'' بنتا ہے اور یہ ایک ایسی کائنات کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی وسعتیں مسلسل پھیلتی جا رہی ہوں۔

عصرِ حاضر کا مشہور ترین فلکی طبیعیات داں اسٹیفن ہاکنگ اپنی تصنیف ''اے بریف ہسٹری آف ٹائم'' میں لکھتا ہے: ''یہ دریافت کہ کائنات پھیل رہی ہے، بیسویں صدی کے عظیم علمی وفکری انقلابات میں سے ایک ہے'' غور فرمایئے کہ قرآن پاک نے کائنات کے پھیلنے کو اس وقت بیان فرما دیا ہے جب انسان نے دوربین تک ایجاد نہیں کی تھی! اس کے باوجود، متشکک ذہن رکھنے والے بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک میں فلکیاتی حقائق کا موجود ہونا کوئی حیرت انگیز بات نہیں، کیونکہ عرب اس علم میں بہت ماہر تھے۔ فلکیات میں عربوں کی مہارت کی حد تک تو اُن کا خیال درست ہے لیکن اس نکتے کا ادراک کرنے میں وہ ناکام ہو چکے ہیں کہ فلکیات میں عربوں کے عروج سے بھی صدیوں پہلے ہی قرآنِ پاک کا نزول ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں، اوپر بیان کردہ بہت سے سائنسی حقائق، مثلاً بگ بینگ، سے کائنات کی ابتدا وغیرہ سے تو عرب اُس وقت بھی واقف نہیں تھے جب وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے عروج پر تھے۔ لہٰذا قرآنِ پاک میں بیان کردہ سائنسی حقائق کسی بھی طرح سے فلکیات میں عربوں کی مہارت کا نتیجہ قرار نہیں دیے جا سکتے۔ درحقیقت اس کے برعکس بات سچ ہے، عربوں نے فلکیات میں اس لیے ترقی کی کیونکہ فلکیاتی وکونیاتی مباحث کو قرآنِ پاک میں اہم مقام دیا گیا ہے۔

طبیعیات

ایٹم بھی تقسیم کیے جاسکتے ہیں:

قدیم زمانوں میں ''ایٹم ازم (Atomism) کا نظریہ'' کے عنوان سے ایک مشہور نظریے کو وسیع پیمانے پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ نظریہ یونانیوں نے بالخصوص دیمو قریطس نامی ایک یونانی فلسفی نے پیش کیا تھا، جو آج سے ۲۳ صدیاں پہلے (۲۳۰۰ سال پہلے) گزرا ہے۔ دیمو قریطس اور بعدازاں اس کے ہم خیال لوگوں کا یہ تصور تھا کہ مادے کا مختصر ترین یونٹ (اکائی) ایٹم ہے۔ قدیم عرب بھی اسی تصور کو تسلیم کیا کرتے تھے۔ عربی لفظ ''ذرّہ'' کا عمومی مفہوم وہی ہوا کرتا تھا جو یونانیوں کے یہاں ایٹم کا تھا۔ حالیہ تاریخ ہی میں سائنس نے دریافت کیا ہے کہ ایٹم تک کو تقسیم کرنا (شق کرنا) ممکن ہے۔ ایٹم کے قابلِ تقسیم ہونے کا تصور بھی بیسویں صدی کی سائنسی پیش رفت میں شامل ہے۔ چودہ صدیاں پہلے خود عربوں کے لیے بھی یہ تصور نہایت غیر معمولی ہوتا۔ ان کے نزدیک ''ذرّہ'' وہ حد تھی جس سے آگے مزید تقسیم ممکن ہی نہیں تھی۔ لیکن درج ذیل آیت مبارکہ میں قرآنِ پاک نے واضح طور پر اس حد کو ماننے سے انکار کیا ہے:

﴿ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّىْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِى الْاَرْضِ وَ لَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾

(القرآن: سورۃ ۳۴، آیت ۳)

''منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آرہی ہے، کہو قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی، وہ تم پر آکر رہے گی۔ اس سے ذرہ برابر کوئی چیز

نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں۔ نہ ذرے سے بڑی اور نہ اس سے چھوٹی۔ یہ سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے۔"

(نوٹ: اسی طرح کا پیغام قرآن پاک کی سورۃ ۱۰، آیت ۶۱ میں بھی دیا گیا ہے۔)

یہ آیتِ مبارکہ ہمیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے عالم الغیب ہونے، یعنی ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز سے باخبر ہونے کے بارے میں بتاتی ہے۔ پھر یہ مزید آگے بڑھتی ہے اور کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے باخبر ہے، چاہے وہ ایٹم سے چھوٹی یا بڑی ہی کیوں نہ ہو۔ تو ثابت ہوا کہ یہ آیت مبارکہ واضح طور پر بتاتی ہے کہ ایٹم سے مختصر اشیا بھی وجود رکھتی ہے..... اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو حال ہی میں جدید سائنس نے دریافت کی ہے۔

آبیات

پانی کا چکر (آبی چکر)

آج ہم جس تصور کو ''آبی چکر'' (واٹر سائیکل) کے نام سے جانتے ہیں، اسے پہلے پہل ۱۵۸۰ء میں برنارڈ پیلیسی نامی ایک شخص نے پیش کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ سمندروں سے کس طرح پانی کی تبخیر (Evaporation) ہوتی ہے اور کس طرح وہ سرد ہو کر بادلوں کی شکل میں آتا ہے۔ پھر یہ بادل خشکی پر آگے کی طرف بڑھتے ہیں، بلند تر ہوتے ہیں، ان میں پانی کی تکثیف (Condensation) ہوتی ہے اور بارش برستی ہے۔ یہ پانی جھیلوں، جھرنوں، ندیوں اور دریاؤں کی شکل میں آتا ہے اور بہتا ہوا واپس سمندر میں چلا جاتا ہے اس طرح پانی کا یہ چکر جاری رہتا ہے۔ ساتویں صدی قبل از مسیح میں تھیلز نامی ایک یونانی فلسفی کو یقین تھا کہ سطح سمندر پر باریک باریک آبی قطروں کی پھوار (اسپرے) پیدا ہوتی ہے تیز ہوا اسی پھوار کو اٹھا لیتی ہے اور خشکی کے دور افتادہ علاقوں پر لے جا کر برسا دیتی ہے۔ یہی بارش ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں، پرانے وقتوں میں لوگ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ زیرِ زمین پانی کا ماخذ کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہوا کی زبردست قوت کے زیر اثر سمندر کا پانی براعظموں (خشکی) میں اندرونی حصوں تک در آتا ہے۔ انہیں یہ یقین بھی تھا کہ پانی ایک خفیہ راستے یا ''عظیم تاریکی'' (Greet Abyss) سے آتا ہے، سمندر سے ملا ہوا یہ تصوراتی راستہ افلاطون کے زمانے سے ''تارتارس'' کہلاتا تھا، حتیٰ کہ اٹھارہویں صدی کے عظیم مفکر، ڈیکارتے (Descartes) نے بھی انہی خیالات سے اتفاق کیا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی تک ارسطو کا نظریہ ہی زیادہ مقبول و معروف رہا۔ اس نظریے کے مطابق، پہاڑوں کے سرد غاروں میں پانی کی تکثیف (Condensation) ہوتی ہے اور وہ

زیرِ زمین جھیلیں بناتا ہے جو چشموں کا باعث بنتی ہیں۔ آج ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ بارش کا پانی زمین پر موجود دراڑوں کے راستے رِس رِس کر زیرِ زمین پہنچتا ہے اور چشموں کی وجہ بنتا ہے، درج ذیل آیاتِ قرآنی میں اس نکتے کی وضاحت فرمائی گئی ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ﴾ (القرآن: سورة ۳۹، آیت ۲۱)

”کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا، پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں۔“

﴿ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيِ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ (القرآن: سورة ۳۰، آیت ۲۴)

”آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔“

﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴾ (القرآن: سورة ۲۳، آیت ۱۸)

”اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اُتارا اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا، ہم اسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں۔“

کوئی دوسری کتاب، جو ۱۴۰۰ سال قدیم ہو، آبی چکر کی اتنی درست وضاحت بیان نہیں کرتی۔

تبخیر (Evaporation)

﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴾ (القرآن: سورة ۸۶، آیت ۱۱)

”قسم ہے بارش برسانے والے آسمان کی۔“

بادلوں کو بارآور (Impregnate) کرتی ہوائیں

﴿ وَ اَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰکُمُوْهُ ﴾

(القرآن: سورۃ ۱۵، آیت ۲۲)

''اور ہم ہی ہواؤں کو بارآور بنا کر چلاتے ہیں، پھر آسمان سے پانی برساتے اور تم کو اس سے سیراب کرتے ہیں۔''

یہاں عربی لفظ ''لواقح'' استعمال کیا گیا ہے، جو ''لاقح'' کی جمع ہے اور ''لاقحہ'' سے مشتق ہے، جس کا مطلب ''بارآور'' کرنا یا ''بھر دینا'' ہے، اسی سیاق وسباق میں، بارآور سے مراد یہ ہے کہ ہوا، بادلوں کو (ایک دوسرے کے) قریب دھکیلتی ہے جس کی وجہ سے ان پر تکثیف کا عمل بڑھتا ہے جس کا نتیجہ بجلی چمکنے اور بارش ہونے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی توضیحات، قرآنِ پاک کی دیگر آیات مبارکہ میں بھی موجود ہیں:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیْنَهٗ ثُمَّ یَجْعَلُهٗ رُکَامًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْ بَرَدٍ فَیُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ یَّشَآءُ یَکَادُ سَنَا بَرْقِهٖ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۴، آیت ۴۳)

''کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے اور پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں اور وہ آسمان سے ان پہاڑوں کی بدولت جو اس میں بلند ہیں اولے برساتا ہے پھر جسے چاہتا ہے ان کا نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچا لیتا ہے اس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔''

﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ کَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ کِسَفًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ

''اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اُٹھاتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے، جس طرح چاہتا ہے اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکایک وہ خوش وخرم ہو جاتے ہیں۔''

آبیات (ہائیڈورلوجی) پر دستیاب، جدید معلومات بھی قرآنِ پاک میں بیان کردہ متعلقہ وضاحتوں کی پوری طرح تائید کرتی ہیں۔ قرآنِ عظیم کی متعدد آیات مبارکہ میں آبی چکر کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔

مثلاً ملاحظہ ہوں: سورۃ ۷، آیت، ۵۷؛ سورۃ ۱۳، آیت ۱۷؛ سورۃ ۲۵، آیات ۴۸ تا ۴۹ ؛سورۃ ۳۵، آیت ۹؛ سورۃ ۳۰، آیت ۳۴؛ سورۃ ۴۵، آیت ۵؛ سورۃ ۵۰، آیات ۹ تا ۱۱؛ سورۃ ۵۶، آیات ۶۸ تا ۷۰؛ اور سورۃ ۶۷، آیت ۳۰.

ارضیات

خیموں کی میخوں کی مانند پہاڑ:

ارضیات میں "بل پڑنے" (Folding) کا مظہر حالیہ دریافت شدہ حقیقت ہے۔ قشرِ ارض (Crust) میں بل پڑنے ہی کی وجہ سے پہاڑی سلسلے وجود میں آئے ہیں۔ قشرِ ارض، جس پر ہم رہتے ہیں، کسی ٹھوس چھلکے کی طرح ہے، جب کہ کرہ زمین کی اندرونی پرتیں، (Layers) نہایت گرم اور مائع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمین کا اندرون کسی بھی قسم کی زندگی کے لیے قطعاً غیر موزوں ہے۔ آج ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ پہاڑوں کی قیام پذیری (Stability) کا تعلق، قشرِ ارض میں بل پڑنے کے عمل سے بہت گہرا ہے، کیونکہ یہ قشرِ ارض پر پڑنے والے بل (Folds) ہی ہیں جو پہاڑوں کا کام کرتے ہیں۔

ماہرین ارضیات کا کہنا ہے کہ زمین کا رداس (Radius) یعنی نصف قطر تقریباً ۶،۰۳۵ کلومیٹر ہے اور قشرِ ارض، جس پر ہم رہتے ہیں، اس کے مقابلے میں بہتر پتلی ہے، جس کی موٹائی ۲ کلومیٹر سے لے کر ۳۵ کلومیٹر تک ہے۔ چونکہ قشرِ ارض بہت پتلی ہے، لہٰذا اس کے تھرتھرانے یا ہلنے کا امکان بھی بہت قوی ہے، ایسے میں پہاڑ کسی خیمے کی میخوں کی طرح کام کرتے ہیں جو قشرِ ارض کو تھام لیتے ہیں اور اسے قیام پذیری عطا کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں بھی عین یہی کہا گیا ہے:

﴿ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ○ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ﴾

(القرآن: سورة ۷۸، آیات ۶تا۷)

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔"

یہاں عربی لفظ "اوتاد" کا مطلب بھی میخیں ہی نکلتا ہے، ویسی ہی میخیں جیسی کہ خیمے کو باندھے رکھنے کے لیے لگائی جاتی ہیں۔ ارضیاتی بلوں، (Folds) یا سلوٹوں کی گہری پوشیدہ بنیادیں بھی یہی ہیں۔

Earth نام کی ایک کتاب ہے جو دنیا بھر کی کئی جامعات میں ارضیات کی بنیادی حوالہ جاتی نصابی کتاب کا درجہ بھی رکھتی ہے، اس کتاب کے مصنفین میں ایک نام ڈاکٹر فرینک پریس کا بھی ہے، جو ۱۲ سال تک امریکہ کی اکیڈمی آف سائنسز کے سربراہ رہے ہیں جبکہ سابق امریکی صدر جمی کارٹر کے زمانے میں صدارتی مشیر برائے سائنس بھی تھے اس کتاب میں وہ پہاڑوں کی وضاحت ،کلہاڑی کے پھل جیسی شکل (Wedge Shape) سے کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ پہاڑ بذاتِ خود ایک وسیع تر وجود کا ایک چھوٹا حصہ ہوتا ہے۔ جس کی جڑیں زمین میں بہت گہرائی تک اُتری ہوتی ہیں۔

(ملاحظہ ہو: Earth از: پریس اور سلور، صفحہ ۴۳۵ مزید دیکھیے: Earth Science از: ٹاربک اور لٹگنز، صفحہ ۱۵۷)

ڈاکٹر فرینک پریس کے مطابق، قشرِ ارض کی پائیداری اور قیام پذیری میں پہاڑ نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

پہاڑوں کے کاموں کی وضاحت کرتے ہوئے، قرآن پاک واضح طور پر یہ فرماتا ہے کہ انہیں اس لیے بنایا گیا ہے تاکہ یہ زمین کو لرزتے رہنے سے بچائیں:

﴿ وَ جَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَبِهِمْ ﴾

(القرآن: سورۃ ۲۱، آیت ۳۱)

"اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔"

اسی طرح کے ارشادات سورۃ ۳۱، آیت ۱۰؛ اور سورۃ ۱۶، آیت ۱۵ میں بھی وارد ہوئے ہیں، لہٰذا قرآنِ پاک کے فراہم کردہ بیانات جدید ارضیاتی معلومات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔

پہاڑوں کو مضبوطی سے جما دیا گیا ہے

سطح زمین متعدد ٹھوس ٹکڑوں، یعنی ''پلیٹوں'' میں ٹوٹی ہوئی ہے جن کی اوسط موٹائی تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر ہے۔ یہ پلیٹیں، جزوی طور پر پگھلے ہوئے حصے کے اوپر گویا تیر رہی ہیں، اس حصے کو (Aesthenosphere) کہا جاتا ہے۔ پہاڑ عموماً پلیٹوں کی بیرونی حدود پر پائے جاتے ہیں۔ قشرِ ارض، سمندروں کے نیچے ۵ کلومیٹر موٹی ہوتی ہے، جب کہ خشکی پر اس کی اوسط موٹائی ۳۵ کلومیٹر تک ہوتی ہے البتہ پہاڑی سلسلوں میں قشرِ ارض کی موٹائی ۸۰ کلومیٹر تک جا پہنچتی ہے، یہی وہ مضبوط بنیادیں ہیں جن پر پہاڑ کھڑے ہیں۔ پہاڑوں کی مضبوط بنیادوں کے بارے میں قرآنِ پاک نے درج ذیل آیت مبارکہ میں کچھ یوں بیان فرمایا ہے:

﴿ وَالْجِبَالَ اَرْسَاهَا ﴾ (القرآن: سورۃ ۷۹، آیت ۳۲)

''اور پہاڑ اس میں گاڑ دیے۔''

اسی طرح کا پیغام سورۃ ۸۸، آیت ۱۹ میں بھی دیا گیا ہے۔ پس، یہ ثابت ہوا کہ قرآن پاک میں پہاڑوں کی ماہیت اور نوعیت کے بارے میں دی گئی معلومات بھی پوری طرح دورِ جدید کی ارضیاتی دریافتوں سے ہم آہنگ ہیں۔

بحریات

میٹھے اور نمکین پانیوں کے درمیان ''آڑ''

﴿ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ﴾

(القرآن: سورۃ ۵۵ آیت ۱۹ تا ۲۰)

''دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں، پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔''

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ان آیات مبارک کے عربی متن میں لفظ ''برزخ'' استعمال ہوا جس کا مطلب رکاوٹ یا آڑ (پارٹیشن) ہے۔ تاہم اسی تسلسل میں ایک اور عربی لفظ ''مرج'' بھی وارد ہوا ہے۔ جس کا مطلب ''وہ دونوں ایک دوسرے سے ملتے اور آپس میں ہم آمیز ہوتے ہیں'' بنتا ہے۔ ابتدائی ادوار کے مفسرین قرآن کے لیے یہ وضاحت کرنا بہت مشکل تھا کہ پانی کے دو مختلف اجسام سے متعلق دو متضاد مفاہیم سے کیا مراد ہے۔ مطلب یہ کہ دو طرح کے پانی ہیں جو آپس میں ملتے بھی ہیں اور ان کے درمیان آڑ (رکاوٹ) بھی ہے۔ جدید سائنس نے دریافت کیا ہے کہ جہاں جہاں دو مختلف بحیرے (Seas) آپس میں ملتے ہیں، وہاں وہاں ان کے درمیان ''آڑ'' بھی ہوتی ہے۔ دو بحیروں کو تقسیم کرنے والی رکاوٹ یہ ہے کہ ان میں سے ایک بحیرہ کا درجہ حرارت، شوریدگی (Salinity) اور کثافت دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

(بحوالہ: پرنسپلز آف اوشنوگرافی، ڈیوس، صفحہ ۹۲ تا ۹۳)

آج ماہرین بحریات مذکورہ آیاتِ مبارکہ کی بہتر وضاحت کر سکتے ہیں۔ دو بحیروں کے درمیان پانی ہی کی ایک نازک اور غیر مرئی رکاوٹ (طبعی قوتوں کی وجہ سے) قائم ہوتی ہے جس سے گزر کر ایک بحیرے کا پانی دوسرے میں شامل ہوتا ہے۔ لیکن جب ایک بحیرے کا پانی،

دوسرے بحیرے میں داخل ہوتا ہے تو وہ اپنی امتیازی خصوصیات کھو دیتا ہے اور دوسرے کے پانی کے ساتھ ہم جنس آمیزہ (Homogeous Mixture) بنا لیتا ہے، گویا ایک طرح سے یہ رکاوٹ کسی عبوری ہم آمیزی والے علاقے کا کام کرتی ہے، جو دونوں بحیروں کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ یہ مظہر درج ذیل آیتِ قرآنی میں بھی بیان کیا گیا ہے:

﴿ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَ جَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴾ (القرآن، سورۃ ۲۷، آیت ۶۱)

”اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں۔“

یہ مظہر متعدد مقامات پر وقوع پذیر ہوتا ہے جن میں جبل الطارق (جبرالٹر) کے علاقے میں بحیرۂ روم اور بحیر اوقیانوس کے ملنے کا مقام نمایاں طور پر قابل ذکر ہے اسی طرح کیپ پوائنٹ اور کیپ پینسولا (Cape Peninsula) جنوبی افریقہ میں بھی (پانی کے بیچ) ایک سفید پٹی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہیں جہاں بحرِ اوقیانوس اور بحرِ ہند کا ایک دوسرے سے ملاپ ہوتا ہے۔

لیکن جب قرآن پاک تازہ اور کھارے پانی کے درمیان رکاوٹ (آڑ) کا تذکرہ کرتا ہے تو اس آڑ کے ساتھ ایک ”ممنوعہ علاقے“ کے بارے میں بھی بتاتا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴾

(القرآن، سورۃ ۲۵، آیت ۵۳)

”اور وہی جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے، ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور

اور ان دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے ایک رکاوٹ ہے جو انہیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔''

جدید سائنس نے دریافت کیا ہے کہ ساحل کے نزدیکی (سمندری) مقامات پر جہاں (دریا کا) تازہ (میٹھا) اور (سمندر کا) نمکین پانی آپس میں ملتے ہیں وہاں کی کیفیت اُن مقامات سے قدرے مختلف ہوتی ہے جہاں دو سمندروں کے نمکین پانی آپس میں ملتے ہیں یہ دریافت ہوا ہے کہ کھاڑیوں (Estuaries) میں تازہ پانی کو کھاری پانی سے جو چیز جدا کرتی ہے وہ ''پکنوکلائن زون'' (Pycnocline Zone) ہے جس کی کثافت غیر مسلسل ہوتی (گھٹتی بڑھتی رہتی) ہے جو (کھاری اور تازہ پانی کی) مختلف پرتوں (Layers) کو ایک دوسرے سے الگ رکھتی ہے۔ (بحوالہ: اوشنوگرافی، از گروس صفحہ ۲۴۲ مزید دیکھئے: انٹروڈکٹری اوشنوگرافی، از تھرمین صفحہ ۳۰۰ تا ۳۰۱) اس رکاوٹ (یعنی علاقۂ امتیاز) کے پانی میں نمک کا تناسب (شوریت) تازہ پانی اور کھاری پانی، دونوں ہی سے مختلف ہوتا ہے۔ (بحوالہ: اوشنوگرافی، صفحہ ۲۴۴ انٹروڈکٹری اوشنوگرافی، صفحہ ۳۰۰ تا ۳۰۱) اس مظہر کا مشاہدہ بھی متعدد مقامات پر کیا گیا ہے جن میں مصر بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے کہ جہاں دریائے نیل، بحیرۂ روم میں گرتا ہے۔

قرآن پاک میں بیان کیے گئے ان سائنسی مظاہر کی تصدیق ''ڈاکٹر ولیم ہے'' نے بھی کی ہے جو کولوراڈو یونیورسٹی امریکہ کے مشہور ماہر بحریات اور علومِ ارضی کے پروفیسر ہیں۔

سمندر کی گہرائیوں میں اندھیرا

پروفیسر درگا راؤ دنیا کے جانے پہچانے ماہر بحری ارضیات ہیں اور وہ شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ (سعودی عرب) میں پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ ان سے درج ذیل آیت مبارکہ پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا گیا:

﴿ اَوْ كَظُلُمَاتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ (القرآن: سورة ۲۴ آیت ۴۰)

''یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے، اس کے اوپر ایک اور موج اور اس کے اوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلط ہے۔ آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے۔ اللہ جسے نور نہ بخشے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔''

پروفیسر راؤ نے کہا کہ سائنس دان صرف حال ہی میں جدید آلات کی مدد سے یہ تصدیق کرنے کے قابل ہوئے ہیں کہ سمندر کی گہرائیوں میں تاریکی ہوتی ہے۔ یہ انسان کے بس سے باہر ہے کہ وہ ۲۰ یا ۳۰ میٹر سے زیادہ گہرائی میں اضافی ساز و سامان اور آلات سے لیس ہوئے بغیر غوطہ لگا سکے۔ علاوہ ازیں، انسانی جسم میں اتنی قوت برداشت نہیں کہ جو ۲۰۰ میٹر سے زیادہ گہرائی میں پڑنے والے آبی دباؤ کا سامنا کرتے ہوئے زندہ بھی رہ سکے۔ یہ آیتِ مبارک تمام سمندروں کی طرف اشارہ نہیں کرتی کیونکہ ہر سمندر کو پرت در پرت تاریکی کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا، البتہ یہ آیتِ مبارک بطور خاص گہرے سمندروں کی جانب متوجہ کرتی ہے کیونکہ قرآن پاک کی اس آیت میں بھی ''وسیع اور گہرے سمندر کی تاریکی'' کا حوالہ دیا گیا ہے، گہرے سمندر کی یہ تہہ در تہہ تاریکی دو اسباب کا نتیجہ ہے۔

اوّل: عام روشنی کی ایک شعاع سات رنگوں سے مل کر بنتی ہے۔ یہ سات رنگ بالترتیب بنفشی، کاسنی، نیلا، سبز، پیلا، نارنجی، سرخ (Vibgyor) ہیں۔ روشنی کی شعاع جب پانی میں داخل ہوتی ہے تو انعطاف (ریفریکشن) کے عمل سے گزرتی ہے اوپر کے دس سے پندرہ میٹر کے دوران پانی میں سرخ رنگ جذب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی غوطہ خور پانی میں پچیس میٹر کی گہرائی تک جا پہنچے اور زخمی ہو جائے تو وہ اپنے خون میں سرخی نہیں دیکھ پائے گا کیونکہ سرخ رنگ کی روشنی اتنی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتی۔ اسی طرح ۳۰ سے ۵۰ میٹر تک کی گہرائی آتے آتے نارنجی (اورنج) روشنی بھی مکمل طور پر جذب ہو جاتی ہے پیلی روشنی ۵۰ سے ۱۱۰ میٹر تک، سبز روشنی ۱۰۰ سے ۲۰۰ میٹر تک، نیلی روشنی ۲۰۰ میٹر سے کچھ زیادہ تک جب کہ کاسنی اور بنفشی روشنی اس سے بھی کچھ زیادہ گہرائی تک پہنچتے پہنچتے مکمل طور پر جذب ہو جاتی ہیں، پانی میں رنگوں کے

اس طرح ترتیب وار غائب ہونے کی وجہ سے سمندر بھی تہہ در تہہ کر کے تاریک ہوتا چلا جاتا ہے، یعنی اندھیرے کا ظہور بھی روشنی کی پرتوں (Layers) کی شکل میں ہوتا ہے۔ ۱۰۰۰ میٹر سے زیادہ کی گہرائی میں مکمل اندھیرا ہوتا ہے۔ (بحوالہ: اوشنز از: ایلڈر اور پرنیا صفحہ ۲۷)

دوم: دھوپ کی شعاعیں بادلوں میں جذب ہوتی ہیں۔ جو نتیجتاً روشنی کی شعاعوں کو ادھر اُدھر بکھیرتے ہیں، جس کی وجہ سے بادلوں کے نیچے تاریکی کی ایک پرت (تہہ) سی بن جاتی ہے۔ یہ تاریکی کی پہلی پرت ہے جب روشنی کی شعاعیں سطح سمندر سے ٹکراتی ہیں تو وہ (سمندری) لہروں کی سطح سے ٹکرا کر پلٹتی ہیں اور جگمگانے کا سا تاثر دیتی ہیں، لہٰذا یہ (سمندری) لہریں ہیں جو روشنی کو منعکس کرتی ہیں تاریکی کی وجہ بنتی ہیں۔ غیر منعکس شدہ روشنی، سمندر کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتی ہے، لہٰذا سمندر کے دو حصے ہوئے، سطح کی امتیازی علامت روشنی اور گرمی ہیں، جب کہ اندھیرا سمندری گہرائیوں کا طرۂ امتیاز ہے، علاوہ ازیں گہرے سمندر اور سطح سمندر کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے والی چیز بھی لہریں ہی ہیں۔

اندرونی موجیں سمندروں کے گہرے پانیوں کا احاطہ کرتی ہیں کیونکہ گہرے پانیوں کی کثافت اپنے اوپر موجود (کم گہرائی والے) پانیوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ اندرونی پانیوں ہی میں تاریکی کا راج ہوتا ہے۔ سمندر کی اتنی گہرائی میں مچھلیاں بھی دیکھ نہیں سکتیں؛ روشنی کا واحد ذریعہ خود ان کے جسم ہوتے ہیں۔

اسی بات کو قرآن پاک نہایت جامع انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

”مثل ان اندھیروں کے ہے جو نہایت گہرے سمندر کی تہہ میں ہوں جسے اوپر تلے کی موجوں نے ڈھانپ رکھا ہو۔“

بالفاظ دیگر، ان لہروں کے اوپر مزید اقسام کی لہریں ہیں، یعنی وہ لہریں جو سمندر کی سطح پر پائی جائیں۔ اسی تسلسل میں یہ آیت مبارکہ فرماتی ہے۔ ”پھر اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں۔ غرض اندھیریاں ہیں جو اوپر تلے پے در پے ہیں۔ جیسا کہ وضاحت کی گئی، یہ بادل وہ پے در پے رکاوٹیں ہیں جو مختلف سطحوں پر روشنی کے مختلف رنگ جذب کرتے ہوئے اندھیرے

کو بڑھاوا دیتی چلی جاتی ہیں۔

پروفیسر درگاراؤ نے یہ کہتے ہوئے اپنی بات مکمل کی ''۱۴۰۰ سال پہلے کوئی عام انسان اس مظہر کو اتنی تفصیل سے بیان نہیں کرسکتا تھا، لہٰذا یہ معلومات یقیناً کسی مافوق الفطرت ذریعے سے آئی ہیں۔''

﴿ وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴾ (القرآن، سورة ۲۵ ،آیت ۵۴)

''اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ سلسلے چلائے۔ تیرا رب بڑا ہی قدرت والا ہے۔''

کیا یہ ممکن تھا کہ چودہ صدیوں پہلے کوئی بھی انسان یہ اندازہ لگا سکے کہ ہر ایک جاندار چیز پانی ہی سے وجود میں آئی ہے؟ مزید برآں کیا یہ ممکن تھا کہ عرب کے ریگزاروں سے تعلق رکھنے والا کوئی فرد ایسا کوئی اندازہ قائم کر لیتا؟ ایسے ریگزاروں کا باشندہ کہ جہاں پانی کی قلت ہمیشہ رہتی ہو۔

نباتیات (Botany)

پودوں میں نر اور مادہ

پرانے زمانے کے انسان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ پودوں میں بھی جانوروں کی طرح نر اور مادہ ہوتے ہیں۔البتہ جدید نباتیات یہ بتاتی ہے کہ ہر پودے کی نر اور مادہ صنف ہوتی ہے۔حتیٰ کہ وہ پودے جو یک صنفی (Unisexual) ہوتے ہیں۔ان میں بھی نر اور مادہ کے امتیازی اجزاء یکجا ہوتے ہیں۔

﴿ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴾

(القرآن، سورۃ ۲۰، آیت، ۵۳)

"اور اوپر سے پانی برسایا اور پھر اس کے ذریعہ سے مختلف اقسام کی پیداوار (جوڑا جوڑا) نکالی۔"

پھلوں میں نر اور مادہ کا فرق

﴿ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ ﴾

(القرآن: سورۃ ۱۳، آیت، ۳)

"اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں۔"

اعلیٰ درجے کے پودوں (Superior Plants) میں نسل خیزی کی آخری پیداوار اُن کے پھل (Fruits) ہوتے ہیں۔پھل سے پہلے پھول کا مرحلہ ہوتا ہے جس میں نر اور مادہ اعضا (Organs) یعنی اسٹیمنز (Stamens) اور اوویولز (Ovules) ہوتے ہیں جب کوئی زردانہ (Pollen) کسی پھول تک پہنچتا ہے،تبھی وہ پھول "بارآور" ہو کر پھل میں بدلنے کے قابل ہوتا ہے۔یہاں تک کہ پھل پک جاتا ہے اور (اُس پودے کی) اگلی نسل کو جنم دینے والے بیج سے

لیس ہو کر تیار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تمام پھل اس امر کا پتا دیتے ہیں کہ (پودوں میں بھی) نر اور مادہ اعضا ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جسے قرآنِ پاک بہت پہلے بیان فرما چکا ہے۔

پودوں کی بعض انواع میں غیر بارآور (Non Fertilized) پھولوں سے بھی پھل بن سکتے ہیں۔ (جنہیں مجموعی طور پر "پارتھینو کارپک فروٹ" کہا جاتا ہے) ان میں کیلے کے علاوہ اناس، انجیر، نارنگی، اور انگور وغیرہ کی بعض اقسام شامل ہیں۔ ان پودوں میں بھی بہت واضح صنفی خصوصیات (Sexual Characteristics) موجود ہوتی ہیں۔

ہر چیز کو جوڑوں میں بنایا گیا ہے

﴿ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴾

(القرآن، سورۃ ۵۱، آیت ۴۹)

"اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں شاید کہ تم اس سے سبق لو۔"

اس آیت مبارکہ میں "ہر چیز" کے جوڑوں کی شکل میں ہونے پر زور دیا گیا ہے۔ انسانوں، جانوروں، پودوں اور پھلوں کے علاوہ بہت ممکن ہے کہ یہ آیت مبارکہ بجلی کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہو کہ جس میں ایٹم منفی بار والے الیکٹرونوں اور مثبت بار والے مرکزے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے جوڑے ہو سکتے ہیں۔

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (القرآن، سورۃ ۳۶، آیت ۳۶)

"پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (یعنی نوعِ انسانی) میں سے یا اُن اشیا میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں۔"

یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر چیز جوڑوں کی شکل میں پیدا کی گئی ہے، جن میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جنہیں آج کا انسان نہیں جانتا اور ہو سکتا ہے کہ آنے والے کل میں انہیں دریافت کر لے۔

حیوانیات (Zoology)

جانوروں اور پرندوں میں معاشرے کا وجود

﴿ وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴾

(القرآن، سورۃ ۶، آیت ۳۸)

''زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اُڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں اور ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔''

تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ جانور اور پرندے بھی ''معاشروں'' (Communities) کی شکل میں رہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اُن میں بھی ایک اجتماعی نظم وضبط ہوتا ہے۔ وہ مل جل کر رہتے ہیں اور کام بھی کرتے ہیں۔

پرندوں کی پرواز

﴿ اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ (القرآن: سورہ ۱۶، آیت ۷۹)

''کیا ان لوگوں نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا کہ فضائے آسمانی میں کس طرح مسخر ہیں۔ اللہ کے سوا کس نے ان کو تھام رکھا ہے۔ اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔''

ایک اور آیت مبارکہ میں پرندوں پر کچھ اس انداز سے بات کی گئی ہے:

﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا

الرَّحْمٰنُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ ﴾ (القرآن: سورۃ ۶۷، آیت ۱۹)

"یہ لوگ اپنے اوپر اُڑنے والے پرندوں کو پر پھیلاتے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے؟

رحمان کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔"

عربی لفظ "امسک" کا لغوی ترجمہ "کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دینا، روکنا، تھامنا، یا کسی کی کمر پکڑ لینا" ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں "یُمْسِکُھُنَّ" سے اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور اپنے اختیار سے پرندوں کو ہوا میں تھامے رکھتا ہے، ان آیات ربانی میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ پرندوں کے طرزِ عمل کا مکمل انحصار اُنہی قوانین پر ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے تخلیق فرمایا ہے۔ (اور جنہیں ہم قوانین فطرت کے نام سے جانتے ہیں) جدید سائنسی معلومات سے ثابت ہو چکا ہے کہ بعض پرندوں میں پرواز کی بے مثل اور بے عیب صلاحیت کا تعلق اس وسیع تر اور مجموعی منصوبہ بندی (پروگرامنگ) سے ہے جو اُن کی حرکات وسکنات سے متعلق ہے۔ مثلاً ہزاروں میل دور تک نقل مکانی کرنے والے پرندوں کی جینیاتی رموز (جینیٹک کوڈز) میں اُن کے سفر کی تمام تر تفصیلات و جزئیات موجود ہوتی ہیں، جو ان پرندوں کو اس قابل بناتی ہیں کہ وہ نہایت کم عمری میں بھی لمبے سفر کے کسی تجربے کے بغیر، کسی رہنما کے بغیر ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر لیں اور پیچیدہ راستوں سے پرواز کرتے چلے جائیں۔ بات صرف سفر کی یک طرفہ تکمیل ہی پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ وہ ایک مخصوص تاریخ پر اپنے عارضی مسکن سے پرواز کرتے ہیں اور ہزاروں میل واپسی کا سفر کر کے ایک بار پھر اپنے گھونسلوں تک بالکل ٹھیک ٹھیک جا پہنچتے ہیں۔

پروفیسر ہیمبر گر نے اپنی کتاب "پاور اینڈ فریجیلیٹی" میں "مٹن برڈ" نامی ایک پرندے کی مثال دی ہے، جو بحرالکاہل کے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ نقل مکانی کرنے والا یہ پرندہ ۲۴،۰۰۰ (چوبیس ہزار) کلومیٹر کا فاصلہ ۸ کی شکل میں چکر لگا کر طے کرتا ہے۔ یہ اپنا سفر چھ ماہ میں پورا کرتا ہے اور مقامِ ابتداء تک زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کی تاخیر سے واپس پہنچ جاتا ہے۔ ایسے کسی سفر کے لیے نہایت پیچیدہ معلومات کا ہونا ضروری ہے جو اس پرندے کے اعصابی خلیات

میں محفوظ ہونی چاہیں۔یعنی ایک باضابطہ ''پروگرام'' کی شکل میں پرندے کے جسم میں موجود اور ہمہ وقت دستیاب ہوتی ہے۔اگر پرندے میں کوئی پروگرام ہے تو کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اسے تشکیل دینے والا کوئی ''پروگرامر'' بھی یقیناً ہے؟

شہد کی مکھی اور اس کی مہارت

﴿ وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ٥ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾

(القرآن: سورۃ ۱۶، آیات ۶۸ تا ۶۹)

''اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں، اپنے چھتے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔ یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں۔''

وان فرش نے شہد کی مکھیوں کے طرزِ عمل اور ان میں رابطہ وابلاغ (کمیونی کیشن) کی تحقیق پر ۱۹۷۳ء کا نوبل انعام حاصل کیا۔شہد کی کسی مکھی کو جب کوئی نیا باغ یا پھول دکھائی دیتا ہے تو وہ اپنے چھتے میں واپس جاتی ہے اور اپنی ساتھی شہد کی مکھیوں کو اُس مقام کی ٹھیک ٹھیک سمت اور وہاں پہنچانے والے راستے کے مفصل نقشے سے آگاہ کرتی ہے۔شہد کی مکھی، پیغام رسانی کا یہ کام خاص طرح کی جسمانی حرکات سے لیتی ہے جنہیں ''شہد کی مکھی کا رقص'' (Bee Dance) کہا جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ عام معنوں والا رقص نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصد شہد کی ''کارکن مکھیوں'' (Worker Bees) کو یہ سمجھانا ہوتا ہے کہ پھول کس سمت ہیں اور وہاں تک پہنچنے کے لیے انہیں کس انداز سے پرواز کرنا ہوگی۔تاہم شہد کی مکھی کے بارے میں یہ

ساری معلومات ہم نے جدید فوٹو گرافی اور دیگر پیچیدہ مشاہداتی ذرائع ہی سے حاصل کی ہیں۔ لیکن ملاحظہ فرمایئے کہ مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں قرآنِ عظیم نے کتنی صراحت کے ساتھ یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کو خاص طرح کی مہارت عطا فرمائی ہے، جس سے لیس ہو کر وہ اپنے رب کے بتائے ہوئے راستے تلاش کر لیتی ہے۔ ایک اور توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں شہد کی مکھی کے لیے جو صنف استعمال کی گئی ہے، وہ مادہ کی ہے (یعنی، فاسلکی اور کلی) اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غذا کی تلاش میں نکلنے والی شہد کی مکھی ''مادہ'' ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر سپاہی یا کارکن شہد کی مکھی بھی مادہ ہی ہوتی ہے۔

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ شیکسپیئر کے ڈرامے ''ہنری دی فورتھ'' میں بعض کردار شہد کی مکھیوں کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ (شہد کی) مکھیاں سپاہی ہوتی ہیں اور یہ کہ اُن کا بادشاہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شیکسپیئر کے زمانے میں لوگ یہی سمجھتے تھے اُن کا خیال تھا کہ شہد کی کارکن مکھیاں ''نر'' ہوتی ہیں اور وہ شہید کی ''بادشاہ مکھی'' (نر) کو جوابدہ ہوتی ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں۔ شہد کی کارکن مکھیاں مادہ ہوتی ہیں اور وہ شہد کی بادشاہ مکھی کو نہیں بلکہ ''ملکہ مکھی'' کو اپنی کارگزاری پیش کرتی ہیں۔ اب اس بارے میں کیا کہا جائے کہ گزشتہ ۳۰۰ سال کے دوران ہونے والی جدید تحقیق کی بدولت ہی ہم یہ سب کچھ دریافت کر پائے ہیں۔

مکڑی کا جالہ، ناپائیدار ترین گھر

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (القرآن: سورة ۲۹، آیت ۴۱)

''جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے۔''

مکڑی کے جالے کو نازک اور کمزور کے طور پر بیان کرنے کے علاوہ، قرآن پاک نے

مکڑی کے گھریلو تعلقات کے بھی نازک اور ناپائیدار ہونے پر زور دیا ہے۔ یہ صحیح بھی ہے، کیونکہ بیشتر اوقات مکڑی اپنے ملاپ کار (Mate) یعنی نر کو مار ڈالتی ہے۔ یہی مثال ایسے لوگوں کی کمزوریوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بھی دی گئی ہے جو دنیا اور آخرت میں تحفظ وکامیابی حاصل کرنے کے لیے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں سے اس کی امید کرتے ہیں۔

چیونٹیوں کا طرزِ حیات اور باہمی روابط

﴿ وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُوْدُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ٥ حَتّٰى إِذَا أَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يَّاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُوْدُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ٥ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۷، آیات ۱۷تا۱۸)

”سلیمان علیہ السلام کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے، اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے (ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ کر رہا تھا) یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: ”اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔“

ہوسکتا ہے کہ ماضی میں بعض لوگوں نے قرآن پاک میں چیونٹیوں کا مذکورہ بالا مکالمہ دیکھ کر اس پر نکتہ چینی کی ہو اور کہا ہو کہ چیونٹیاں تو صرف کہانیوں کی کتابوں ہی میں باتیں کرتی ہیں۔ البتہ، حالیہ برسوں کے دوران ہمیں چیونٹیوں کے طرزِ حیات باہمی روابط اور پیچیدہ معلومات کے تبادلے کے حوالے سے بہت کچھ علم ہو چکا ہے۔ یہ معلومات دورِ جدید سے پہلے کے انسانوں کو حاصل نہ تھیں۔ تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ وہ جانور یا وہ حشرات (کیڑے مکوڑے) جن کا طرزِ حیات انسانی معاشرت سے غیر معمولی مماثلت رکھتا ہے، وہ چیونٹیاں ہی ہیں۔ اس کی تصدیق چیونٹیوں کے بارے میں درج ذیل حالیہ دریافتوں سے بھی ہوتی ہے:

الف۔ چیونٹیاں بھی اپنے مردوں کو انسانوں کی طرح دفناتی ہیں۔

ب۔ ان میں کارکنان کی تقسیم کا پیچیدہ نظام موجود ہے جس میں منیجر، سپروائزر، فورمین اور مزدور وغیرہ شامل ہیں۔

ج۔ کبھی کبھار وہ آپس میں ملتی ہیں اور ''گفتگو'' (Chat) بھی کرتی ہیں۔

د۔ ان میں باہمی تبادلہ خیال (کمیونی کیشن) کا ترقی یافتہ نظام موجود ہے۔

ہ۔ ان کی کالونیوں میں باقاعدہ ''مارکیٹیں'' ہوتی ہیں جہاں وہ اشیا کا تبادلہ کرتی ہیں۔

ی۔ سردیوں میں لمبے عرصے تک زیرِ زمین رہنے کے لیے وہ اناج کے دانوں کا ذخیرہ بھی کرتی ہیں۔اور اگر کوئی دانہ پھوٹنے لگے، یعنی اس سے پودا بننے لگے تو وہ فوراً اس کی جڑیں کاٹ دیتی ہیں۔ جیسے انہیں یہ پتا ہو کہ اگر وہ اس دانے کو یونہی چھوڑ دیں گی تو وہ بڑھنا اور پکنا شروع کر دے گا۔ اگر ان کا محفوظ کیا ہوا اناج کسی بھی وجہ سے مثلاً بارش سے گیلا ہو جائے تو وہ اسے اپنے بل سے باہر لے جاتی ہیں اور دھوپ میں سکھاتی ہیں۔ جب اناج سوکھ جاتا ہے تبھی وہ اسے بل میں واپس لے کر جاتی ہیں۔ یعنی یوں لگتا ہے، جیسے انہیں یہ علم ہو کہ نمی کی وجہ سے اناج کے دانے سے جڑیں نکل پڑیں گی جو دانے کو اس قابل نہیں چھوڑیں گی کہ اسے کھایا جا سکے۔

طبّ (میڈیسن)

شہد: نوعِ انسانی کے لیے شفا

شہد کی مکھی کئی طرح کے پھلوں اور پھولوں کا رس چوستی ہے اور اسے اپنے ہی جسم کے اندر شہد میں تبدیل کرتی ہے۔ اس شہد کو وہ اپنے چھتے میں بنے خانوں (Cells) میں جمع کرتی ہے۔ آج سے صرف چند صدیوں قبل ہی انسان کو یہ معلوم ہوا ہے کہ شہد اصل میں شہد کی مکھی کے پیٹ (Belly) سے نکلتا ہے، مگر یہ حقیقت قرآن پاک نے ۱۴۰۰ سال پہلے درج ذیل آیت مبارکہ میں بیان کردی تھی:

﴿ ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۱۶، آیت ۶۹)

"ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس، اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہ پر چلتی رہ۔ اس مکھی کے (پیٹ کے) اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔ یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔"

علاوہ ازیں ہم نے حال ہی میں یہ دریافت کیا ہے کہ شہد میں شفا بخش خصوصیات پائی جاتی ہیں اور یہ اوسط درجے کے دافعِ عفونت (مائلڈ اینٹی سپٹک) کا کام بھی کرتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں روسیوں نے بھی اپنے زخمی فوجیوں کے زخم ڈھانپنے کے لیے شہد کا استعمال کیا تھا۔ شہد کی خاصیت ہے کہ یہ نمی کو برقرار رکھتا ہے اور بافتوں پر زخموں کے بہت ہی کم نشان باقی رہنے دیتا ہے۔ شہد کی کثافت (Density) کے باعث کوئی پھپھوندی یا جراثیم، زخم میں پروان

نہیں چڑھ سکتے۔

سسٹر کیرول نامی ایک عیسائی راہبہ (Nun) نے برطانوی شفا خانوں میں بیٹے اور الزائیمر کے عارضوں میں مبتلا بائیس ۲۲ نا قابل علاج مریضوں کا علاج پروپولس (Propolis) نامی مادے سے کیا۔ شہد کی مکھیاں یہ مادہ پیدا کرتی ہیں اور اسے اپنے چھتوں کو جرثوموں کے خلاف سربند (Seal) کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی پودے سے ہونے والی الرجی میں مبتلا ہو جائے تو اسی پودے سے حاصل شدہ شہد اس شخص کو دیا جا سکتا ہے تاکہ وہ الرجی کے خلاف مزاحمت پیدا کر لے۔ شہد وٹامن کے اور فرکٹوز (ایک طرح کی شکر) سے بھی بھر پور ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں شہد اس کی تشکیل اور خصوصیات کے بارے میں جو علم دیا گیا ہے اسے انسان نے نزول قرآن کے صدیوں بعد اپنے تجربے اور مشاہدے سے دریافت کیا ہے۔

فعلیات (Physiology)

دورانِ خون (بلڈ سرکولیشن) اور دودھ

قرآن پاک کا نزول، دورانِ خون کی وضاحت کرنے والے اوّلین مسلمان سائنس دان ابن النفیس سے ۶۰۰ سال پہلے اور اس دریافت کو مغرب میں روشناس کروانے والے ولیم ہاروے سے ۱۰۰۰ سال پہلے ہوا تھا۔ تقریباً تیرہ صدیوں پہلے یہ معلوم ہوا کہ آنتوں کے اندر ایسا کیا کچھ ہوتا ہے جو نظام ہاضمہ میں انجام پانے والے افعال کے ذریعے دیگر جسمانی اعضا کی نشوونما کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ قرآنِ پاک کی ایک آیت مبارک، جو دودھ کے اجزا کے ماخذ کی وضاحت کرتی ہے، اس تصور کی عین مطابقت میں ہے۔

مذکورہ بالا تصور کے حوالے سے آیت قرآنی کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا اہم ہے کہ آنتوں میں کیمیائی تعاملات (Reactions) واقع ہوتے ہیں اور یہ کہ آنتوں ہی سے ہضم کردہ غذا سے اخذ کیے ہوئے مادے ایک پیچیدہ نظام سے گزر کر دورانِ خون میں شامل ہوتے ہیں۔ کبھی وہ (مادّے) جگر سے ہو کر گزرتے ہیں جس کا انحصار ان کی کیمیائی ترکیب پر ہوتا ہے۔ خون ان اجزا (مادّوں) کو تمام اعضا تک پہنچاتا ہے، جن میں دودھ پیدا کرنے والے (چھاتیوں کے) غدود بھی شامل ہیں۔

سادہ الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنتوں میں موجود غذا کے بعض مادے آنتوں کی دیوار سے سرایت کرتے ہوئے خون کی نالیوں (Vessels) میں داخل ہو جاتے ہیں، اور پھر خون کے راستے یہ دورانِ خون کے ذریعے کئی اعضا تک جا پہنچتے ہیں۔ یہ فعلیاتی تصور مکمل طور پر لازماً ہماری گرفت میں آ جائے گا، اگر ہم قرآن پاک کی درج ذیل آیات مبارکہ کو سمجھنے کی کوشش کریں گے:

﴿ وَ اِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ١٦، آیت ٦٦)

''اور تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ، جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔''

﴿ وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِمَّا فِىْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ٢٣، آیت ٢١)

''اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمہیں پلاتے ہیں اور تمہارے لیے ان میں بہت سے فائدے بھی ہیں۔ ان کو تم کھاتے ہو۔''

١٤٠٠ سال قبل، قرآن پاک کی فراہم کردہ یہ وضاحت جو گائے میں دودھ کے پیدا ہونے کے حوالے سے ہے، حیرت انگیز طور پر جدید فعلیات سے بھرپور انداز میں ہم آہنگ ہے جس نے اس حقیقت کو حال ہی میں دریافت کیا ہے۔

جنینیات (Embryology)

مسلمان جوابات کی تلاش میں

یمن کے معروف عالم، شیخ عبدالمجید الزندانی کی قیادت میں مسلمان اسکالروں کے ایک گروپ نے جنینیات (ایمبر یالوجی) اور دیگر (سائنسی) علوم کے بارے میں قرآن پاک اور مستند احادیث سے معلومات جمع کیں اور انہیں انگریزی میں ترجمہ کیا۔ پھر انہوں نے قرآن پاک کے ایک مشورے پر عمل کیا:

﴿ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (القرآن: سورة ١٦، آیت ٤٣)

''اے نبی! ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے۔ اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم خود نہیں جانتے۔''

جب قرآن پاک اور مستند احادیث مبارکہ سے جنینیات کے بارے میں حاصل کی گئی معلومات یکجا ہو کر انگریزی میں ترجمہ ہو گئیں تو انہیں پروفیسر ڈاکٹر کیتھ مور کے سامنے پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر کیتھ مور، یونیورسٹی آف ٹورانٹو (کینیڈا) میں ڈیپارٹمنٹ آف اناٹومی کے سربراہ اور جنینیات کے پروفیسر ہیں۔ آج کل وہ جنینیات (ایمبر یالوجی) کے میدان میں مقتدر اور معتبر ترین شخصیت بھی ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ وہ انہیں پیش کیے گئے علمی مواد کے بارے میں اپنی رائے دیں۔ محتاط مطالعے کے بعد ڈاکٹر کیتھ مور نے کہا کہ جنینیات کے متعلق آیات قرآنی اور مستند احادیث میں بیان کردہ تقریباً تمام معلومات، جدید سائنسی دریافتوں کی عین مطابقت میں ہیں جدید جنینیات سے ان کا بھرپور اتفاق ہے اور وہ کسی بھی طرح جدید جنینیات سے

اختلاف نہیں کرتیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ البتہ بعض آیات ایسی بھی ہیں جن کی سائنسی درستگی کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ آیات (سائنس کی مطابقت میں) صحیح ہیں یا غلط، کیونکہ خود انہیں ان آیات میں دی گئی معلومات کے متعلق کچھ علم نہیں۔ ان کے متعلق جنینیات کے جدید مطالعات اور مقالہ جات تک میں بھی کچھ موجود نہ تھا۔ ایسی ہی ایک آیت مبارکہ درج ذیل ہے:

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۞ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴾

(القرآن: سورۃ ۹۶، آیات ۱ تا ۲)

"پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔"

یہاں عربی لفظ "علق" استعمال ہوا ہے جس کا ایک مطلب تو خون کا لوتھڑا ہے، جب کہ دوسرا مطلب کوئی ایسی چیز ہے جو "چمٹ" جاتی ہو، یعنی جونک جیسی کوئی شے ہو۔ ڈاکٹر کیتھ مور کو علم نہیں تھا کہ حمل کے ابتدائی مرحلوں میں جنین (ایمبریو) کی شکل جونک جیسی ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے انہوں نے نہایت طاقتور اور حساس آلات کی مدد سے جنین کے ابتدائی مراحل کا بڑے محتاط انداز میں مطالعہ کیا اور پھر ان تصاویر کا موازنہ جونک کے خاکے سے کیا۔ وہ ان دونوں کے درمیان غیر معمولی مشابہت دیکھ کر حیران رہ گئے، اسی طرح انہوں نے جنینیات کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں جو قرآن پاک سے تھیں اور جن سے وہ قبل ازیں واقف نہیں تھے۔

ڈاکٹر کیتھ مور نے جنینیاتی معلومات سے متعلق قرآن وحدیث سے حاصل شدہ مواد پر تقریباً ۸۰ سوالوں کے جوابات دیے، قرآن وحدیث میں جنینیات کے حوالے سے موجود علم صرف جدید سائنسی معلومات سے ہم آہنگ ہی نہ تھا بلکہ بقول ڈاکٹر کیتھ مور اگر آج سے تیس سال پہلے مجھ سے یہی سب سوالات کیے جاتے تو سائنسی معلومات کی عدم موجودگی کے باعث میں ان میں سے آدھے سوالوں کے جوابات بالکل بھی نہیں دے سکتا تھا۔

۱۹۸۱ء میں دمام (سعودی عرب) میں منعقدہ، ساتویں طبی کانفرنس کے دوران ڈاکٹر مور نے کہا" میرے لیے نہایت خوشی کا مقام ہے کہ میں نے قرآن میں انسان کی (دورانِ حمل) نشوونما سے متعلق پیش کردہ نکات کی وضاحت کرنے میں مدد کی۔ اب مجھ پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ ساری معلومات محمد (ﷺ) تک خدا یا اللہ نے ہی پہنچائی ہیں کیونکہ کم وبیش یہ سارا علم (نزول قرآن کے) کئی صدیوں بعد ہی دریافت کیا گیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد (ﷺ) بلاشبہ خدا یا اللہ کے رسول ہی تھے۔"

قبل ازیں ڈاکٹر کیتھ مور ایک کتاب "دی ڈیویلپنگ ہیومین" لکھ چکے تھے۔ قرآن پاک سے نئی معلومات سے حاصل ہو جانے کے بعد انہوں نے ۱۹۸۲ء میں اسی کتاب کا تیسرا ایڈیشن مرتب کیا۔ اس ایڈیشن کو عالمی پذیرائی حاصل ہوئی اور اس کتاب نے کسی ایک مصنف کی لکھی ہوئی بہترین طبی کتاب کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ یہ کتاب دنیا کی کئی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے اور اسے میڈیکل کی تعلیم کے پہلے سال میں اک نصابی کتاب کے طور پر بھی پڑھایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر جو سمپسن، بیلر کالج آف میڈیسن، ہیوسٹن (امریکہ) میں شعبہ حمل وزچگی (آبسٹیٹرکس اینڈ گائنا کولوجی) کے چیئرمین ہیں۔ ان کا کہنا ہے "یہ احادیث، محمد (ﷺ) کی کہی ہوئی باتیں، کسی بھی طرح مصنف کے زمانے (ساتویں صدی عیسوی) میں دستیاب سائنسی معلومات کی بنیاد پر پیش نہیں کی جا سکتی تھیں، اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوا کہ جنیات (Genetics) اور مذہب (یعنی اسلام) میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ بھی پتا چلا کہ مذہب (اسلام) اس طرح سے سائنس کی رہنمائی کر سکتا ہے کہ روایتی سائنسی اندازِ نظر میں کچھ الہامی انکشافات بھی شامل کرتا چلا جائے۔ قرآن میں ایسے بیانات موجود ہیں جن کی توثیق کئی صدیوں بعد ہوئی۔ جس سے اس (یقین) کو تقویت ملتی ہے کہ قرآن میں دیا گیا علم واقعی خدا کی طرف سے آیا ہے۔"

ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان سے خارج ہونے والا قطرہ

﴿ فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ ۝ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ﴾ (القرآن: سورۃ ۸٦، آیات ۵ تا ۷)

''پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا۔ ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔''

جنینی مراحل میں مردانہ و زنانہ تولیدی اعضاء یعنی فوطے (Testicles) اور بیضہ دان (Ovary) گردوں پاس سے ریڑھ کی ہڈی اور گیارہویں/بارہویں پسلیوں کے درمیان سے نموپذیر ہونا شروع کرتے ہیں۔ بعدازاں وہ کچھ نیچے اتر آتے ہیں؛ زنانہ تولیدی غدود (Gonads) یعنی بیضہ دانیاں پیڑو (Pelvis) میں رک جاتی ہیں جب کہ مردانہ اعضائے تولید (Inguinal Canal) کے راستے خصیہ دانی (Scrotum) تک جا پہنچتے ہیں۔ حتیٰ کہ بلوغت میں بھی جب کہ تولیدی غدود کے نیچے سرکنے کا عمل رک چکا ہوتا ہے ان غدود میں دھڑ والی اورطہ (Abdominal Aorta) کے ذریعے خون اور اعصاب کی رسائی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دھیان رہے کہ دھڑ والی اورطہ اُس علاقے میں ہوتی ہے جو ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ لمفی نکاس (Lymphetic Drainage) اور خون کا وریدی بہاؤ بھی اسی سمت ہوتا ہے۔

نطفہ: مائع کی معمولی سی مقدار

قرآن عظیم میں کم از کم گیارہ مرتبہ کہا گیا ہے کہ انسان کو ''نطفہ'' سے تخلیق کیا گیا ہے جس کا مطلب مائع کی نہایت معمولی مقدار یا پیالہ خالی ہو جانے کے بعد اس میں لگا رہ جانے والا مائع ہے۔ یہ بات قرآنِ عالی شان کی کئی آیات مبارکہ میں وارد ہوئی ہے جن میں سورۃ ۲۲ آیت ۵ اور سورۃ ۲۳، آیت ۱۳ کے علاوہ سورۃ ۱٦، آیت ۴؛ سورۃ ۱۸ آیت ۳۷؛ سورۃ ۳۵، آیت ۱۱؛ سورۃ ۳٦، آیت ۷۷؛ سورۃ ۴۰ آیات ٦۷؛ سورۃ ۵۳، آیت ۴٦؛ سورۃ ۷٦، آیت ۲؛ اور سورۃ ۸۰ آیت ۱۹ شامل ہیں۔

سائنس نے حال ہی میں یہ دریافت کیا ہے کہ بیضے (Ovum) کو بار آور کرنے کے لیے اوسطاً تیس لاکھ خلیاتِ نطفہ (Sperms) میں سے صرف ایک کی ضرورت ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ خارج ہونے والے نطفے کی مقدار کا تیس لاکھواں حصہ یا ۰۰۰۰۳ ،۰ فیصد مقدار ہی بار آوری (حمل ٹھہرانے) کے لیے کافی ہوتی ہے۔

"سُلٰلَة": مائع کا جوہر

﴿ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴾ (القرآن: سورۃ ۳۲، آیت ۸)

"پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح ہے۔"

عربی لفظ سُلٰلَة سے مراد کسی مائع کا بہترین حصہ، خلاصہ یا جوہر ہے۔ اب ہم جان چکے ہیں زنانہ بیضے کی بار آوری کے لیے مرد سے خارج ہونے والے لاکھوں کروڑوں خلیاتِ نطفہ میں سے صرف ایک کی ضرورت ہوتی ہے۔ لاکھوں کروڑوں میں سے اسی ایک خلیۂ نطفہ کو قرآنِ پاک نے "سُلٰلة" کہا ہے۔ اب ہمیں یہ بھی پتا چل چکا ہے کہ عورت میں پیدا شدہ ہزاروں بیضوں (Ovam) میں سے صرف ایک ہی بار آور ہوتا ہے۔ ان ہزاروں بیضوں میں سے اسی ایک بیضے کے لیے (جو بار آور ہوتا ہے) قرآنِ پاک نے "سُلٰلة" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس لفظ کا ایک اور مفہوم کسی مائع سے (کسی چیز کا) بڑی احتیاط سے اخراج بھی ہے۔ اس مائع سے مراد زنانہ اور مردانہ، دونوں طرح کے تولیدی مائعات بھی ہیں جن میں صنفی تخم (Gametes) موجود ہوتے ہیں۔ بار آوری کے مرحلے کے دوران نطفہ خلیہ اور بیضہ دونوں ہی اپنے اپنے ماحول سے بہ احتیاط جدا ہوتے ہیں۔

نطفةٍ امشاج..... باہم ملے ہوئے مائعات

﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴾ (القرآن: سورۃ ۷۶، آیت ۲)

"ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔"

عربی لفظ " نطفة أمشاج " کا مطلب ملے ہوئے مائعات" ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک ملے ہوئے مائعات سے مراد عورت یا مرد کے (تولیدی) عامل (ایجنٹ) یا مائعات ہیں مردانہ اور زنانہ صنفی تخم کے باہم مل جانے کے بعد بننے والا جفتہ (Zygote) بھی ابتدا میں نطفہ ہی رہتا ہے۔ باہم ملے ہوئے (ہم آمیز) مائعات سے ایک اور مراد وہ مائع بھی ہو سکتا ہے جس میں خلیاتِ نطفہ تیر رہے ہوتے ہیں۔ یہ مائع کئی طرح کی جسمانی رطوبتوں سے مل کر بنتا ہے جو کئی جسمانی غدود سے خارج ہوتی ہیں۔

لہٰذا، "نطفةٍ امشاج "یعنی آپس میں ملے ہوئے مائعات کے ذریعے مردانہ و زنانہ صنفی مواد (تولیدی مائع یا خلیات) اور اس کے اردگرد مائعات کے کچھ حصے کی جانب اشارہ کیا جارہا ہے۔

جنس کا تعین

پختہ جنین (Foetus) کی جنس کا تعین (یعنی اس سے لڑکا ہوگا یا لڑکی) خلوی نطفے سے ہوتا ہے نہ کہ بیضہ سے مطلب یہ کہ رحم مادر میں ٹھہرنے والے حمل سے لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی اس کا انحصار کروموسوم کے 23 ویں جوڑے میں بالترتیب XX/XY کروموسومز کی موجودگی پر ہوتا ہے۔ ابتدائی طور پر جنس کا تعین بارآوری کے موقع ہی پر ہو جاتا ہے اور اس کا انحصار خلوی نطفے (اسپرم) کے صنفی کروموسوم (سیکس کروموسوم) پر ہوتا ہے جو بیضے کو بارآور کرتا ہے۔ اگر بیضے کو بارآور کرنے والے اسپرم میں X صنفی کروموسوم ہے تو ٹھہرنے والے حمل سے لڑکی پیدا ہو گی۔ اس کے برعکس، اگر اسپرم میں صنفی کروموسوم Y ہے تو حمل کے نتیجے میں لڑکا پیدا ہوگا۔

﴿ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ۝ ﴾

(القرآن: سورۃ ۵۳، آیات ۴۵ تا ۴۶)

"اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا، ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے۔"

یہاں عربی لفظ نطفہ کا مطلب تو مائع کی نہایت قلیل مقدار ہے جب کہ " تُمنیٰ " کا

مطلب شدت سے ہونے والا اخراج یا پودے کی طرح بوئی گئی کوئی چیز ہے۔لہٰذا نطفہ بطورِ خاص اسپرم ہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کیونکہ یہ شدت سے خارج ہوتا ہے۔قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴾

(القرآن: سورۃ۷۵،آیات۳۷،۳۹)

''کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔''

ملاحظہ فرمایئے کہ یہاں ایک بار پھر یہ بتایا گیا ہے کہ نہایت قلیل مقدار (قطرے) پر مشتمل مادۂ تولید (جس کے لیے عربی عبارت '' نطفةً مِّنْ مَّنِيٍّ '' وارد ہوئی ہے) جو کہ مرد کی طرف سے آتا ہے) رحمِ مادر میں بچے کی جنس کے تعین کا ذمہ دار ہے۔ برصغیر میں یہ افسوس ناک رواج ہے کہ عام طور پر ساسوں کو پوتیوں سے زیادہ پوتوں کا ارمان ہوتا ہے۔اور اگر بہو کے ہاں بیٹوں کے بجائے بیٹیاں ہو رہی ہوں تو وہ انہیں ''اولادِ نرینہ'' پیدا نہ کر سکنے پر طعنے دیتی ہیں۔اگر انہیں صرف یہی پتا چل جاتا کہ اولاد کی جنس کے تعین میں عورت کے بیضے کا کوئی کردار نہیں اور اس کی تمام تر ذمہ داری مردانہ نطفے پر عاید ہوتی ہے اور اگر پھر بھی وہ لعن طعن پر آمادہ ہوں تو انہیں چاہیے کہ وہ (اولادِ نرینہ کے نہ ہونے پر) اپنی بہوؤں کے بجائے اپنے بیٹوں کو کوسنے دیں۔قرآنِ پاک اور جدید سائنس دونوں ہی اس پر متفق ہیں کہ بچے کی جنس کے تعین میں مردانہ تولیدی مواد ہی ذمہ دار ہے،عورت کا اس میں کوئی قصور نہیں۔

تین تاریک پردوں کی حفاظت میں رکھا گیا بطن

﴿ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ

خَلْقٍ فِيْ ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۳۹، آیت ۶)

''اسی نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ پھر وہی ہے جس نے اس جان سے اس کا جوڑا بنایا اور اسی نے تمہارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے۔ اور وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے، کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے۔ پھر تم کدھر سے پھرائے جا رہے ہو۔''

پروفیسر ڈاکٹر کیتھ مور کے مطابق، قرآن پاک میں تاریکی کے جن تین پردوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ شکمِ مادر کی اگلی دیوار

۲۔ رحمِ مادر کی دیوار

۳۔ غلافِ جنین اور اس کے گرد لپٹی ہوئی جھلی

جنینی (ایمبریانک) مراحل

﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۳، آیات ۱۲ تا ۱۴)

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔''

ان آیاتِ مبارک میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان کو مائع کی نہایت قلیل مقدار سے تخلیق کیا گیا ہے جسے سکون (Rest) والی جگہ میں رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ (مائع) اُس جگہ پر مضبوطی سے چمٹا رہتا ہے۔ (یعنی قیام پذیر حالت میں جکڑے ہوئے) اور اسی کے لیے قرآن پاک میں ''قرارِ مکین'' کی عبارت وارد ہوئی ہے۔ رحمِ مادر کے پچھلے حصے کو ریڑھ کی ہڈی اور کمر کے پٹھوں کی بدولت کافی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اس جنین (ایمبریو) کو مزید تحفظ جنینی تھیلی (Amniotic Sac) سے حاصل ہوتا ہے جس میں جنینی مائع (Amniotic Fluid) بھرا ہوتا ہے۔ تو ثابت ہوا کہ رحمِ مادر ایک ایسی ''جائے قرار'' (رُکنے کی جگہ) ہے جسے بخوبی تحفظ دیا گیا ہے۔

مائع کی مذکورہ قلیل مقدار ''علقۃ'' کی شکل میں ہوتی ہے یعنی ایک ایسی چیز کی شکل میں جو ''چمٹ جانے'' کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس سے مراد جونک جیسی کوئی چیز بھی ہے۔ یہ دونوں توضیحات سائنسی اعتبار سے قابلِ قبول ہیں، کیونکہ بالکل ابتدائی مراحل میں جنین واقعتاً رحمِ مادر کی دیوار سے چمٹ جاتا ہے جب کہ اس کی ظاہری شکل بھی کسی جونک سے مشابہت رکھتی ہے۔ اس کا طرزِ عمل بھی جونک ہی کی طرح کا ہوتا ہے، کیونکہ یہ آنول نال کے راستے اپنی ماں کے جسم سے خون حاصل کرتا (اور اس سے اپنی غذا اخذ کرتا) ہے۔

علقۃ کا تیسرا مطلب ''خون کا لوتھڑا'' ہے۔ اس ''علقۃ'' والے مرحلے سے جو حمل ٹھہرنے کے تیسرے اور چوتھے ہفتے پر محیط ہوتا ہے۔ بند رگوں کے اندر خون جمنے لگتا ہے۔ لہٰذا جنین کی شکل صرف جونک جیسی ہی نہیں رہتی بلکہ وہ خون کے لوتھڑے جیسا بھی دکھائی دینے لگتا ہے۔

اب ہم قرآنِ پاک کی فراہم کردہ معلومات، اور صدیوں کی جدوجہد کے بعد سائنس کی حاصل کردہ جدید معلومات کا موازنہ کریں گے۔

۱۶۷۷ء میں ہیم اور لیون ہاک وہ دو اوّلین سائنسدان تھے، جنہوں نے خردبین سے انسانی خلیاتِ نطفہ (اسپرمانوزوآ) کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ نطفے کے ہر خلیے میں ایک چھوٹا سا انسان موجود ہوتا ہے جو رحمِ مادر میں پروان چڑھتا ہے اور ایک نوزائیدہ بچے کی

شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس نظریے کو'' پرفوریشن تھیوری'' بھی کہا جاتا تھا۔ بعدازاں جب سائنس دانوں نے یہ دریافت کیا کہ (عورت کا) بیضہ، نطفے کے خلیے سے کہیں زیادہ بڑا ہوتا ہے تو مشہور ماہر ڈی گراف سمیت کئی سائنس دانوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ بیضے کے اندر ہی انسانی وجود نہایت مختصر (خردبینی) حالت میں پایا جاتا ہے۔ اس کے بھی بہت عرصے بعد، اٹھارہویں صدی عیسوی میں (Maupeitius) نامی سائنسدان نے اس نظریے کی تشہیر کرنا شروع کی کہ (مذکورہ بالا دونوں ابتدائی خیالات کے برعکس) کوئی بچہ اپنے ماں اور باپ دونوں کی مشترکہ وراثت (Inheritence) ہوتا ہے۔

علقۃ تبدیل ہوتا ہے اور ''مضغۃ'' کی شکل میں آتا ہے، جس کا مطلب ہے ایسی کوئی چیز جسے چبایا گیا ہو (یعنی جس پر دانتوں کے نشانات ہوں) اور کوئی ایسی چیز ہو جو چپچی (لیس دار) اور مختصر ہو یعنی جسے چیونگم کی طرح منہ میں رکھا جا سکتا ہو۔ یہ دونوں توضیحات سائنسی اعتبار سے درست ہیں۔ پروفیسر کیتھ مور نے پلاسٹوسین (ربر اور چیونگم جیسے مادے) کا ایک ٹکڑا لے کر اسے ابتدائی مرحلے والے جنین کی شکل دی اور دانتوں سے چبا کر ''مضغہ'' میں تبدیل کیا۔ پھر انہوں نے اس (تجرباتی) مضغہ کی ساخت کا موازنہ ابتدائی جنین (Foetus) کی تصاویر سے کیا۔ اس پر موجود، دانتوں کے نشانات انسانی مضغہ پر پڑے ''سومائٹس'' (Somites) سے مشابہ تھے جو (جنین میں) ریڑھ کی ہڈی کی ابتدائی شکل کو ظاہر کرتے ہیں۔

اگلے مرحلے میں یہ مضغہ تبدیل ہو کر ہڈیوں کا روپ (عظم) دھارتا ہے۔ ان ہڈیوں کے گرد نازک اور مہین گوشت یا پٹھوں (لحم) کا غلاف ہوتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اسے ایک بالکل ہی الگ مخلوق کی شکل دے دیتا ہے۔

امریکہ میں چوٹی کے ایک سائنسدان پروفیسر مارشل جونس سے (جو فلاڈلفیا میں واقع تھومس جیفرسن یونیورسٹی میں اناٹومی ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ اور اسی یونیورسٹی میں ڈینٹل انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر بھی ہیں) یہ کہا گیا کہ وہ جنینیات کے حوالے سے آیاتِ قرآنی پر تبصرہ کریں پہلے انہوں نے کہا کہ متعدد جنینی مراحل کو بیان کرنے والی قرآنی آیات کسی بھی طرح سے

اتفاق کا حاصل نہیں ہو سکتیں، اور ہو سکتا ہے کہ محمد (ﷺ) کے پاس بہت ہی طاقتور خردبین رہی ہو۔ جب انہیں یہ یاد دلایا گیا کہ قرآنِ پاک کا نزول ۱۴۰۰ سال پہلے ہوا تھا اور دنیا کی اوّلین خردبین بھی حضرت محمد (ﷺ) کے سینکڑوں سال بعد ایجاد ہوئی تھی، تو پروفیسر جونس ہنسے اور یہ تسلیم کیا ایجاد ہونے والی اولین خردبین بھی دس گنا سے زیادہ بڑی شبیہ دکھانے کے قابل نہیں تھی اور اس کی مدد سے واضح (خردبینی) منظر بھی دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ بعدازاں انہوں نے کہا: ”سردست مجھے اس تصور میں کوئی تنازعہ دکھائی نہیں دیتا کہ جب محمد (ﷺ) نے قرآنِ پاک کی آیات پڑھیں تو اُس وقت یقیناً کوئی آسمانی (الہامی) قوت بھی ساتھ میں کارفرما تھی۔“

ڈاکٹر کیتھ مور کا کہنا ہے کہ جنینی نشوونما کے مراحل کی وہ درجہ بندی جو آج ساری دنیا میں رائج ہے، آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کیونکہ اس میں ہر مرحلے کو ایک عدد (نمبر) کے ذریعے شناخت کیا جاتا ہے۔ مثلاً مرحلہ نمبر۱ مرحلہ نمبر۲ وغیرہ۔ دوسری جانب قرآنِ پاک نے جنینی مراحل کی جو تقسیم بیان فرمائی ہے اس کی بنیاد جداگانہ اور بہ آسانی شناخت ہونے کے قابل حالتوں یا ساختوں پر ہے۔ یہی وہ مراحل ہیں جن سے کوئی جنین مرحلہ وار انداز میں گزرتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ حالتیں، (ساختیں) بھی قبل از ولادت نشوونما کے مختلف مراحل کی علمبردار ہیں اور ایسی سائنسی توضیحات (وضاحتیں) فراہم کرتی ہیں جو نہایت عمدہ اور قابلِ فہم ہونے کے ساتھ ساتھ عملی اہمیت بھی رکھتی ہیں۔ رحمِ مادر میں انسانی جنین کی نشوونما کے مختلف مراحل درج ذیل آیاتِ مبارکہ میں بھی بیان فرمائے گئے ہیں:

﴿ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ٥ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ٥ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ٥ ﴾

(القرآن: سورۃ ۷۵، آیات ۳۷ تا ۳۹)

”کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحمِ مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے پھر اس سے مرد

اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔"

﴿ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ ٥ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ٥ ﴾ (القرآن: سورۃ ۸۲، آیات ۷ تا ۸)

"جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نک سک سے درست کیا، تجھے متناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا۔"

نیم مکمل اور نیم نامکمل جنین

اگر مضغہ کے مرحلے پر جنین کو درمیان سے کاٹا جائے اور اس کے اندرونی حصوں کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں واضح طور پر نظر آئے گا کہ (مضغہ کے اندرونی اعضا میں سے) بیشتر پوری طرح بن چکے ہیں جب کہ بقیہ اعضا اپنی تکمیل کے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ پروفیسر جونس کا کہنا ہے کہ اگر ہم پورے جنین کو ایک مکمل وجود کے طور پر بیان کریں تو ہم صرف اسی حصے کی بات کر رہے ہوں گے جو پہلے سے مکمل ہو چکا ہے۔ اور اگر ہم اسے نامکمل وجود کہیں تو پھر ہم جنین کے ان حصوں کا حوالہ دے رہے ہوں گے جو ابھی پوری طرح سے مکمل نہیں ہوئے بلکہ تکمیل کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اس موقع پر جنین کو کیا کہنا چاہیے: مکمل وجود یا نامکمل وجود؟ جنینی نشوونما کے اس مرحلے کی جو وضاحت قرآن پاک نے ہمیں دی ہے، اس سے بہتر کوئی اور وضاحت ممکن نہیں۔ قرآن پاک اس مرحلے کو "نیم مکمل اور نیم نامکمل" قرار دیتا ہے۔ درج ذیل آیات مبارکہ ملاحظہ فرمایئے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ وَ نُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۲ آیت ۵)

"لوگو! اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر

گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔"

سائنسی نقطۂ نگاہ سے ہم جانتے ہیں کہ جنینی نشوونما کے اس ابتدائی مرحلے پر کچھ خلیات ایسے ہوتے ہیں جو جداگانہ شکل اختیار کر چکے ہیں جب کہ کچھ خلیات امتیازی شکل میں آئے نہیں ہوتے۔ یعنی کچھ اعضا بن چکے ہوتے ہیں اور کچھ ہنوز غیر تشکیل شدہ حالت میں ہوتے ہیں۔

سننے اور دیکھنے کی حسیات

رحمِ مادر میں نشوونما پانے والے انسانی وجود میں سب سے پہلے جو حس جنم لیتی ہے وہ سننے کی حس (حسِ سامعہ) ہوتی ہے۔ ۲۴ ہفتوں بعد کا پختہ جنین (Foetus) آوازیں سننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ پھر حمل کے ۲۸ ویں ہفتے تک دیکھنے کی حس (بصارت بھی وجود میں آ جاتی ہے اور پردۂ چشم (Retina) روشنی کے لیے حساس ہو جاتا ہے۔ ان مراحل کو قرآنِ پاک یوں بیان فرماتا ہے:

﴿ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾ (القرآن: سورة ۳۲ آیت ۹)

"پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں اور دل دیے تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔"

﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ﴾ (القرآن: سورة ۷۶، آیت ۲)

"ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔"

﴿ وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾ (القرآن: سورة، ۲۳، آیت۷۸)

''وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں دیکھنے اور سننے کی قوتیں دیں اور سوچنے کو دل دیئے مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔''

ملاحظہ فرمایئے کہ تمام آیات مبارکہ میں حسِ سماعت کا تذکرہ حسِ بصارت سے پہلے آیا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ قرآنِ پاک کی فراہم کردہ توضیحات، جدید جنینیات میں ہونے والی دریافتوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔

عمومی سائنس

نشاناتِ انگشت (فنگر پرنٹس)

﴿ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ○ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰۤی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ○ ﴾ (القرآن: سورۃ ۷۵، آیات ۳تا۴)

''کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔''

کفار اور ملحدین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص مر جانے کے بعد مٹی میں مل جاتا ہے اور اس کی ہڈیاں تک خاک کا پیوند ہو جاتی ہیں، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ قیامت کے روز اُس کے جسم کا ایک ایک ذرہ دوبارہ یکجا ہو کر پہلے والی (زندہ) حالت میں واپس آ جائے...... اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو روزِ محشر اس شخص کی ٹھیک ٹھیک شناخت کیونکر ہو گی؟ اللہ تعالیٰ ربِ ذوالجلال نے مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں اسی اعتراض کا بہت واضح جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ (اللہ تعالیٰ) صرف اسی پر قدرت نہیں رکھتا کہ ریزہ ریزہ ہڈیوں کو واپس یکجا کر دے۔ بلکہ اس پر بھی قادر ہے کہ ہماری انگلیوں کی پوروں تک کو دوبارہ سے پہلے والی حالت میں ٹھیک ٹھیک طور پر لے آئے۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآنِ پاک انسانوں کی انفرادی شناخت کی بات کر رہا ہے تو ''انگلیوں کی پوروں'' کا خصوصیت سے تذکرہ کیوں کر رہا ہے؟ سر فرانس گالٹ کی تحقیق کے بعد ۱۸۸۰ء میں نشاناتِ انگشت (فنگر پرنٹس) کو شناخت کے سائنسی طریقے کا درجہ حاصل ہوا۔ آج ہم یہ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں کوئی سے بھی دو افراد کی انگلیوں کے نشانات کا نمونہ بالکل ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ ہم شکل جڑواں افراد کا بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا بھر میں

مجرموں کی شناخت کے لیے ان کے فنگر پرنٹس ہی استعمال کیے جاتے ہیں۔

کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے کس کو نشاناتِ انگشت کی انفرادیت کے بارے میں معلوم تھا؟ یقیناً یہ علم رکھنے والی ذات اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔

جلد میں درد کے آخذے (Receptors)

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ محسوسات اور درد وغیرہ کا انحصار صرف اور صرف دماغ پر ہوتا ہے۔ البتہ حالیہ دریافتوں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ جلد میں درد کو محسوس کرنے والے آخذے (Receptors) ہوتے ہیں۔ اگر یہ خلیات نہ ہوں تو انسان درد کو محسوس کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

جب کوئی ڈاکٹر کسی مریض میں جلنے کے باعث پڑنے والے زخموں کا معائنہ کرتا ہے تو وہ جلنے کا درجہ (شدت) معلوم کرنے کے لیے (جلے ہوئے مقام پر) سوئی چبھو کر دیکھتا ہے۔ اگر سوئی چبھنے سے متاثرہ شخص کو درد محسوس ہوتا ہے تو ڈاکٹر کو اس پر خوشی ہوتی ہے...... کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جلنے کا زخم صرف باہر کی حد تک ہے اور درد محسوس کرنے والے خلیات (درد کے آخذے) محفوظ ہیں۔ اس کے برخلاف، اگر متاثرہ شخص کو سوئی چبھنے پر درد محسوس نہ ہو تو یہ تشویشناک امر ہوتا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جلنے سے بننے والے زخم کی گہرائی زیادہ ہے اور درد کے آخذے بھی مردہ ہو چکے ہیں۔

درج ذیل آیت مبارکہ میں قرآن پاک نے بہت واضح الفاظ میں درد کے آخذوں کی موجودگی کے بارے میں بیان فرمایا ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴾ (القرآن: سورۃ ۴، آیت ۵۶)

”جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے انہیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تا کہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا

ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔"

تھائی لینڈ میں چیانگ مائی یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ آف اناٹومی کے سربراہ پروفیسر تیگاتات تیجاسان نے درد کے آخذوں پر تحقیق میں بہت وقت صرف کیا ہے۔ پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ قرآنِ پاک نے ۱۴۰۰ سال پہلے اس سائنسی حقیقت کا انکشاف کر دیا ہو گا۔ تاہم، بعدازاں جب انہوں نے مذکورہ آیتِ قرآنی کے ترجمے کی باقاعدہ تصدیق کر لی تو وہ قرآن پاک کی سائنسی درستگی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ سعودی عرب کے شہر ریاض میں منعقدہ آٹھویں سعودی طبی کانفرنس کے موقع پر (جس کا موضوع قرآنِ پاک اور سنت میں سائنسی نشانیاں تھا) انہوں نے بھرے مجمعے میں فخر وانبساط کے ساتھ کہا:

لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ محمد الرسول اللّٰہ

(اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (اور) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں)

حرفِ آخر

قرآن پاک میں سائنسی حقائق کی موجودگی کو اتفاق قرار دینا بیک وقت عقلِ سلیم (کامن سینس) اور صحیح سائنسی اندازِ نظر کے بالکل خلاف ہوگا۔ درحقیقت قرآنی آیات کی سائنسی درستگی قرآن پاک کے واضح اعلان کی تائید کرتی ہے:

﴿ سَنُرِيهِمْ ءَايَـٰتِنَا فِى ٱلْـَٔافَاقِ وَفِىٓ أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ ٱلْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُۥ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ شَهِيدٌ ﴾

(القرآن: سورۃ ۴۱، آیت ۵۳)

”عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ کافی نہیں کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔“

قرآن پاک تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ کائنات کی تخلیق پر غور وفکر کریں:

﴿ إِنَّ فِى خَلْقِ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَٱخْتِلَـٰفِ ٱلَّيْلِ وَٱلنَّهَارِ لَـَٔايَـٰتٍ لِّأُو۟لِى ٱلْأَلْبَـٰبِ ﴾ (القرآن: سورۃ ۳، آیت ۱۹۰)

”زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوش مندوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔“

قرآن پاک میں موجود سائنسی شواہد واشگاف انداز میں ثابت کرتے ہیں کہ یہ واقعی الہامی ذریعے سے نازل ہوا ہے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے کوئی انسان ایسا نہیں تھا جو اس قدر اہم اور درست سائنسی حقائق پر مبنی کوئی کتاب لکھ سکتا۔

تاہم قرآن پاک کوئی سائنسی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ ”نشانیوں“ (Signs) کی کتاب

ہے۔ یہ نشانیاں انسان کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ زمین پر اپنے وجود کی غرض وغایت کا احساس کرے اور فطرت سے ہم آہنگی اختیار کرتے ہوئے رہے۔ اس میں کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ قرآنِ پاک اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا کلام ہے...... رب العالمین کا کلام کہ جو کائنات کا خالق ومالک بھی ہے اور اسے چلا بھی رہا ہے۔

اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا وہی پیغام ہے جس کی تبلیغ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیائے کرام نے کی۔

قرآن اور جدید سائنس کے موضوع پر کثیر تفصیلی علمی مواد قلم بند کیا جا چکا ہے اور اس میدان میں تحقیق ہمہ وقت جاری ہے۔ ان شاء اللہ یہ تحقیق بھی نوع انسانی کو اللہ تعالیٰ کے کلام سے قریب لانے میں معاون ثابت ہوگی۔ اس مختصر سی کتاب میں قرآن پاک کے پیش کردہ صرف چند سائنسی حقائق جمع کیے گئے ہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے اس موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔

پروفیسر تیجاسان نے قرآن پاک میں بیان کی گئی صرف ایک سائنسی نشانی کی مضبوطی کے باعث اسلام قبول کیا۔ بہت ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو دس اور بعض کو ۱۰۰ سائنسی نشانیوں کی ضرورت ہو، تاکہ وہ قرآن کے من جانب اللہ ہونے کو تسلیم کر سکیں، کچھ لوگ شاید ایسے بھی ہوں جو ہزار نشانیاں دیکھ لینے کے باوجود بھی سچائی کو قبول کرنا نہ چاہتے ہوں۔ قرآن پاک نے اس تنگ نظری کی درج ذیل آیتِ مبارکہ میں مذمت فرمائی ہے:

﴿ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲، آیت ۱۸)

''بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، یہ اب نہ پلٹیں گے۔''

قرآن پاک انفرادی زندگی اور اجتماعی معاشرت، سب ہی کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ الحمد للہ قرآن پاک ہمیں زندگی گزارنے کا جو طریقہ بتاتا ہے وہ ان تمام ''ازموں'' سے بالاتر ہے جو جدید انسان نے محض اپنی کم فہمی اور لاعلمی کی بنا پر ایجاد کیے ہیں کیا یہ ممکن ہے

کہ خود خالق سے بہتر کوئی اور رہنمائی دے سکے؟ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عاجزانہ کوشش کو قبول فرمائے ہم پر رحم فرمائے اور ہمیں صحیح راستہ دکھائے۔ (آمین)

ہماری دیگر کتابیں

مذاہب عالم میں تصور خدا	ڈاکٹر ذاکر نائیک
اسلام دہشت گردی یا عالمی بھائی چارہ	ڈاکٹر ذاکر نائیک
بائبل اور قرآن (جدید سائنس کی روشنی میں)	ڈاکٹر ذاکر نائیک
کیا قرآن کلام خداوندی ہے؟	ڈاکٹر ذاکر نائیک
اسلام اور ہندومت	ڈاکٹر ذاکر نائیک
اسلام میں خواتین کے حقوق	ڈاکٹر ذاکر نائیک
گوشت خوری جائز یا ناجائز	ڈاکٹر ذاکر نائیک
فتاویٰ	ڈاکٹر یوسف القرضاوی
مولانا شبلی نعمانیؒ بحیثیت سیرت نگار	ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی
وحی حدیث	ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
عبدالمطلب ہاشمی حضور ﷺ کے دادا	ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
تدوین سیر و مغازی	مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ
علامہ شبلی نعمانیؒ کی قرآن فہمی	ڈاکٹر محمد مسعود عالم قاسمی
ہندو علماء و مفکرین کی قرآنی خدمات	اورنگ زیب اعظمی
عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال	اسرار عالم

کتاب سرائے

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور۔ فون: 7320318
ای میل: hikmat100@hotmail.com

فضلی بک سپر مارکیٹ
اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724